دسمبر 2016ء

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک بادشاہ بے اولاد تھا۔ جب اس کی موت کا وقت نزدیک آیا تو اس نے وصیت کی کہ میری موت کے دوسرے دن جو شخص سب سے پہلے شہر میں داخل ہو، میری جگہ اسے بادشاہ بنا دیا جائے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ دوسرے دن جو شخص سب سے پہلے شہر میں داخل ہوا وہ ایک فقیر تھا جس کی ساری زندگی در در کی بھیک مانگتے اور اپنی گودڑی میں پیوند پر پیوند لگانے میں گزری تھی۔ امیروں، وزیروں نے بادشاہ کی وصیت کے مطابق اسے بادشاہ بنا دیا اور وہ تاج و تخت اور خزانوں کا مالک بن کر بہت شان سے زندگی گزارنے لگا۔ فطرت ہے کہ حاسد اور کم ظرف لوگ کسی کو آرام میں دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگتے ہیں۔ اس فقیر کے ساتھ بھی یہی ہوا جو اب بادشاہ بن گیا تھا۔ اس کے دربار کے کچھ امراء نے آس پاس کے حکمرانوں سے سازباز کر کے ملک پر حملہ کروا دیا، بہت سا علاقہ ان حملہ آوروں نے فتح کر لیا۔ اس حادثے کی وجہ سے فقیر بادشاہ بہت افسردہ رہنے لگا۔ اتفاق سے انہی دنوں اس کا ایک ساتھی فقیر ادھر آ نکلا اور اپنے یار کو ایسی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اسے مبارک باد دی کہ خدا نے تیرا مقدر سنوارا اور فرشِ خاک سے اُٹھا کر تختِ افلاک پر بٹھا دیا۔ فقیر کی یہ بات بالکل درست تھی۔ کہاں در در کی بھیک مانگنا اور کہاں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونا لیکن اس شخص کو تو اب بادشاہ بن جانے کی خوشی سے زیادہ ملک کا کچھ حصہ چھن جانے کا غم تھا۔ فقیر بادشاہ غم بھری آواز میں بولا۔ ''ہاں دوست! تیری یہ بات تو غلط نہیں لیکن تجھے کیا معلوم کہ میں کیسی فکروں میں گھرا ہوا ہوں۔ تجھے تو صرف اپنی دو روٹیوں کی فکر ہو گی لیکن مجھے ساری رعایا کی فکر ہے۔'' دُنیا کا تو یہ حال ہے کہ اگر یہ ہمیں حاصل نہ ہو تو مفلس ہونے کا غم کرتے ہیں اور جب حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی محبت میں ہر چیز کو بھلا دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دُنیا سے بڑھ کر کوئی بلا نہیں۔

پیارے بچو! دُنیا کا بڑے سے بڑا اعزاز پا کر بھی انسان کو سچا اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ ایسا چاہنے والوں کو مسلسل تکلیف میں مبتلا رکھنا دُنیا کی ایسی عادت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس بات کا خواہش مند ہے کہ اسے سچی راحت اور حقیقی اطمینان نصیب ہو تو اسے چاہیے دُنیا کی ہوس ترک کر کے قناعت اختیار کرے۔

اسی مہینے اسلامی کیلنڈر کا تیسرا مہینا ربیع الاوّل شروع ہو چکا ہے۔ اس مبارک مہینے میں اللہ تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ دُنیا میں تشریف لائے تھے۔ آپؐ نے گم راہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کو اسلام کا سیدھا راستہ دکھایا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اپنے پیارے نبیؐ کی تعلیمات پر سچے دل سے عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

لیجیے اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجویز سے آگاہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق لعل بدخشاں

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔

ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمدِ باری تعالیٰ

پرندوں کی صداؤں میں چھپا ہے
تُو گلشن کی فضاؤں میں چھپا ہے
ٹھکانا ہے ترا عرشِ معلیٰ
تُو مومن کی دعاؤں میں چھپا ہے
جو رحمت بن کے برسیں کل جہاں پر
تو ان کالی گھٹاؤں میں چھپا ہے
بظاہر جو نظر آتی ہیں خالی
تو مولا ان خلاؤں میں چھپا ہے
جو چلتی ہیں مدینہ میں ہمیشہ
تو ان ٹھنڈی ہواؤں میں چھپا ہے
جو پچھلی رات کرتا ہے مسلماں
خدا ان التجاؤں میں چھپا ہے
وہ جس کی ذات ذات لم یزل ہے
محمدؐ کی اداؤں میں چھپا ہے

لم یزل: ہمیشہ رہنے والا

نعت رسولِ مقبول ﷺ

آپؐ جب اس دہر میں لائے گئے
رحمتوں کے پھول برسائے گئے
بھیج کر سدرہ نشیں جبریل کو
عرش پر ہیں آپؐ بلوائے گئے
جب شبِ معراج گزرے ہیں حضورؐ
انبیاء بھی منتظر پائے گئے
خالقِ کونین کی جانب سے آپؐ
مالکِ کونین ٹھہرائے گئے
جانی دشمن کی خطا بھی بخش دی
آپؐ اتنے رحم دل پائے گئے
ہیں شفیع المذنبیںؐ جن کے طفیل
کتنے عاصی رب سے بخشائے گئے
جو غلامانِ محمدؐ ہیں انہیں
مغفرت کے ہار پہنائے گئے

ریاض حسین قمر

عاصی: گناہ گار
کونین: دین و دنیا، دونوں جہان
سدرہ نشین: بیری کے درخت کے مکین، مراد حضرت جبریلؑ۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ ''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔'' (سورۂ آل عمران: 31)

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ کی محبت کا اہل اور اس کا پیارا بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں ان پر عمل کیا جائے لیکن دینِ اسلام نے سب سے بہتر تدبیر کو اختیار کیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی پیاری زندگی کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، اور اس کی پیروی اور اتباع کرنے کو معیار بنایا ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ تب درست ہوگا کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد ﷺ کی اتباع کرو گے۔

پیارے نبیؐ کی پیاری زندگی کا ہر ہر پہلو روشن و نمایاں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک مثالی نمونہ بنا کر بھیجا ہے اور ہمیں یہ ہدایت دی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ، ہر دور اور ہر حال میں اس نمونہ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں۔ ہماری عبادتیں یعنی نماز، روزہ، حج وغیرہ اسی رنگ میں ہونا چاہیے جس طرح آپؐ یہ تمام عبادتیں ادا فرماتے تھے۔ ہمارا رہن سہن آپؐ کے رہن سہن کے مطابق ہو۔ ہماری چال ڈھال، نشست و برخاست کا وہی طریقہ ہو جو آپؐ کا پیارا طریقہ ہے۔ ہمارا لباس و پوشاک اسی کے مطابق ہو جو آپؐ پسند فرماتے تھے۔ ہماری تجارت اور خرید و فروخت انہی اصولوں پر ہو جو آپؐ نے وضع فرمائے ہیں اور ان کے مطابق تجارت فرمائی ہے۔ ہمارے اخلاق کے لیے بھی نمونہ کوئی اور نہیں، صرف آپؐ کی ذاتِ اقدس ہی ہے۔

نبی پاک ﷺ کی زندگی کو دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور و طریق کی اصلاح اور درستگی کر سکتا ہے۔ اسی اتباع کی بدولت دُنیاوی اور اخروی نعمتیں ملتی ہیں۔ اصل چیز یہی ہے کہ تمام عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں، ہر کیفیت میں آپؐ کی اتباع ہو۔ کسی بھی بات یا چیز میں قدم سنتِ نبوی ﷺ سے ہٹنے نہ پائے۔

حضرت امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ ''سنت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہے، جو اس میں سوار ہو گیا بچ گیا اور جو اس میں سوار نہ ہوا تو وہ غرق ہو گیا۔'' (تزکیۃ النفوس 13/1)

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلایا، آپؑ نے نو سو پچاس سال تک اللہ کا یہ پیغام قوم کو سنایا، مگر سوائے چند نفوس کے کوئی ایمان نہ لایا۔ جب طوفانِ نوح آیا تو نجات پانے والے صرف وہ لوگ تھے جو حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائے اور وہ آپؑ کے ساتھ کشتی پر سوار تھے، جن لوگوں نے آپؑ کی نافرمانی کی اور آپؑ پر ایمان نہ لائے، ان کو کشتی میں جگہ نہیں ملی، وہ سب طوفان میں غرق ہو گئے۔ بالکل اسی طرح نبی پاک ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والا گم راہی سے نجات پانے والا ہے اور سنت کو چھوڑنے والا گم راہی میں پڑنے والا ہے۔

نبی پاکؐ کی پیاری سنتوں کی اتباع کی نیت سے کوئی کام کر لیں گے تو آخرت میں بھی اجر ملے گا اور دُنیا میں بھی برکت ہو گی اور اس کو چھوڑنے سے بے برکتی ہو گی، بے چینی بڑھے گی، گناہوں سے رغبت ہو گی اور دل ظلمتوں کا شکار ہو گا۔

نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جس نے میری سنت کو زندہ کیا (یعنی اس پر عمل کیا) تو اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔''

(ترمذی، ابواب العلم: 2678)

پیارے بچو! اگر آپ چاہتے ہیں دُنیا اور آخرت کی کامیابی اور آپؐ کا قرب...... تو پھر آپ پیارے نبی ﷺ کے پیارے طریقوں (سنتوں) کے پابند رہیں اور آپؐ پر بکثرت درود پڑھیں۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام، اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ جب کعبۃ اللہ کی تعمیر کر رہے تھے تو اس وقت ان کے لب پر یہ دعا تھی:

اے اللہ! ان لوگوں میں ان ہی کی قوم سے رسول بھیج جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔

571ء کو مکے میں اسی خاندان کے سلسلے سے وہ نور اُترا جس نے جہالت اور ظلم کے اندھیرے کو ختم کرنا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی آمد سارے عالم کے لیے سعادت ہے۔ اُس وقت کہیں ہزاروں سال سے جلنے والی آگ بجھی تو کہیں محل کے کنگرے ٹوٹ کر گرے۔

مکے میں بی بی آمنہ کے آنگن میں اُترنے والا چاند اپنی ولادت کے وقت یتیم تھا۔ آپؐ کے والد، آپؐ کی پیدائش سے چھ ماہ پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ پیدائش کے فوراً بعد عربوں کے طریقے کے مطابق گاؤں کی پُرفضا اور صاف ماحول میں پرورش کے لیے بی بی حلیمہ سعدیہ کے حوالے کر دیا گیا۔

کچھ سال گزار کر آپؐ واپس آئے۔ ابھی عمر مبارک چھ سال ہی تھی کہ اپنی والدہ کے ساتھ سفر پر گئے۔ واپسی میں یہ عزیز ہستی بھی آپؐ کو چھوڑ کر اللہ کے پاس چلی گئی۔ ماں کا یوں چلے جانا کسی بھاری صدمے سے کم نہ تھا۔ آپؐ نے انتہائی صبر کے ساتھ اسے برداشت کیا۔

آپؐ اب اپنے دادا عبدالمطلب کی پرورش میں آگئے۔ دادا اسے بے حد پیار کرتے تھے۔ دو سال بعد وہ بھی انتقال فرما گئے۔ اب نبی کریم ﷺ آٹھ سال کی عمر سے اپنے چچا ابو طالب کی زیرِ نگرانی آگئے۔

بچپن اسی طرح مشقت کرتے اور دکھوں کو جھیلتے ہوئے گزرا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے کردار کو بلند رکھا۔ جہالت کی بُری باتوں میں خود کو کبھی نہ الجھایا۔ آپؐ کو اعلیٰ کردار اور امانت دار ہونے کے باعث مکے کے لوگ صادق اور امین کہتے تھے۔

اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اکثر تجارتی سفر پر جایا کرتے تھے۔ ایک روز مکے کی ایک مال دار خاتون کے کہنے پر اس کا مال بھی لے کر ملک شام گئے۔ واپسی میں آپؐ نے تمام تر منافع ان کے حوالے کر دیا۔ وہ مال دار خاتون حضرت خدیجہؓ کی عمر 40 سال اور ہمارے نبیؐ کی عمر مبارک 25 سال تھی۔

مکے میں اس وقت جہالت اور بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ آپؐ کو یہ دیکھ کر سخت دلی تکلیف ہوتی تھی۔ آپؐ اُس وقت امانت اور

صداقت کے اس معیار پر تھے، جہاں تک پہنچنا اہلِ مکہ کے بس کی بات نہ تھی۔ آپؐ اکثر غور وفکر اور عبادت کرنے کے لیے جبلِ نور پر واقع غارِ حرا میں جایا کرتے تھے۔ آپؐ وہاں گھنٹوں غور وفکر اور عبادت کیا کرتے تھے۔

آپؐ اکثر سوچا کرتے تھے کہ ہمیں کیوں پیدا کیا گیا ہے اور ہم سے کیا کام لیا جائے گا؟ ایک روز آپؐ اسی طرح عبادت میں مصروف تھے کہ ایک فرشتہ حضرت جبرئیل امینؑ آئے اور آپؐ کو اپنے ساتھ لگا کر زور سے بھینچا اور کہا: ''اقراء'' (پڑھیے)۔ آپؐ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اسی طرح تین مرتبہ آپؐ کو بھینچا گیا۔ پھر آپؐ نے سورۃ العلق کی پانچ آیتیں پڑھیں، جس طرح حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو پڑھایا۔ یہ آپؐ کی نبوت کا آغاز تھا۔ اور سورۃ العلق کی یہ ابتدائی پانچ آیات پہلی وحی تھی۔

آپؐ نے اللہ کے ایک ہونے اور اسی کی عبادت کرنے کا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچایا، مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے آپؐ کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ آپؐ کو ستانا اور راستے میں کانٹے بچھانا بھی شروع کیا۔ یہ بُرا سلوک وہ نہ صرف آپؐ کے ساتھ کرتے، بلکہ اس ظلم اور زیادتی کا شکار وہ مسلمان بھی ہوتے جنہوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہا اور دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو آہستہ آہستہ مکے سے ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ نے بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ مدینے کی جانب ہجرت کی۔ اس دوران تین دن اور تین راتیں آپؐ غارِ ثور میں رہے۔

مدینہ، اس وقت یثرب کہلاتا تھا۔ آپؐ اس سے پہلے قبا پہنچے اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد تھی۔ آپؐ نے مدینے میں اپنا قیام پسند فرمایا۔ اس وقت آپؐ کی عمر مبارک 53 سال تھی۔ 40 سال کی عمر میں نبوت کا اعلان ہونے کے بعد آپؐ نے 13 سال مکے میں گزارے۔ ان کے ظلم وستم کے بعد آپؐ نے ہجرت کی۔ اب مدینے میں اسلام کو پھیلنے کا بہتر موقع مل رہا تھا مگر دوسری جانب مکے کے کافروں کو یہ پسند نہیں تھا۔

ابھی آپؐ کو مدینے آئے دوسرا سال ہی تھا کہ کافروں نے مسلمانوں کو جنگ پر اُبھارا۔ وہ ایک ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھائی کرنے آ گئے۔ نبی کریم ﷺ اپنے 313 جاں نثاروں کے ہمراہ بدر کے کنویں کے پاس پہنچے۔ جنگ کا آغاز ہوا، کافر مسلمانوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھے، مگر یہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ مسلمانوں کا جوش اسلام کے لیے تھا۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی نبی کریمؐ نے اللہ کے حضور مسلمانوں کو کام یابی کے لیے دعا مانگی۔ مسلمان کم تعداد کے باوجود کافروں پر بھاری رہے۔ بالآخر جنگ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔ اس جنگ میں کافروں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔

ایک کے بعد دوسری جنگ ہوتی رہی اور کافروں کو نقصان پہنچتا رہا۔ بالآخر سن 8 ہجری میں نبی کریم ﷺ بڑی شان سے فاتح بن کر اسی مکہ شہر میں داخل ہوئے، جہاں سے انہیں نکالا گیا تھا۔ ان کے ساتھیوں کو اذیتیں دی گئیں۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے کہ اب ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اس وقت رحمت للعالمینؐ نے سب کو معاف کرنے کا اعلان کیا۔

10 ہجری میں آپؐ نے حج کیا اور اس موقع پر تقریباً سوا لاکھ مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عظیم الشان خطبہ دیا جو معاشرے کی بقاء اور ترقی کا ضامن ہے۔

جب نبی رحمتؐ کا وصال 11 ہجری میں ہوا تو اس وقت دینِ اسلام دُنیا کے کئی حصوں پر اپنے نور کی کرنیں بکھیر چکا تھا۔

☆☆☆

بُروں سے اچھا سلوک

ایک شب ایک چور ایک نیک لیکن غریب شخص کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر بہت ہاتھ مارے لیکن وہاں کچھ ہوتا تو اسے ملتا۔ اتفاق سے اس دوران میں نیک مرد بھی جاگ گیا اور آہٹ کی آواز سن کر سمجھ گیا کہ گھر میں چور گھسا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ اپنے گھر کا حال کون سمجھ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اسے بہت افسوس ہوا کہ چور نے اتنی محنت کی اور وہ میرے گھر سے خالی ہاتھ جائے گا۔ اس نے جلدی سے وہ کمبل اُتارا جو خود اوڑھے ہوئے تھا اور چور کے راستے میں پھینک دیا۔ سچ ہے، اللہ والوں کے دلوں میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی خیرخواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ کسی کو بھی رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے۔ ......☆

رحمتوں کی کثرت یا عیبوں کی پردہ پوشی

بوعلی سینا سے کسی نے پوچھا کہ دن کیسے گزر رہے ہیں؟ وہ رو پڑے اور کہنے لگے کہ گناہ گار ہونے کے باوجود اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات پر اس کا شکر ادا کروں۔ نعمتوں کی کثرت پر یا اپنے عیبوں کی پردہ پوشی پر! (اظہر حسین ہاشمی، لاہور) ......☆

سردار حیات کی چوپال کا منظر دیکھ کر فضل دین بہت حیران ہوا۔ ایک آراستہ کرسی پر سردار جی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے گول میز پر گلاب کے پھولوں سے سجی ایک ٹوکری رکھی ہوئی تھی۔ پھولوں کی مہک سارے ماحول کو مہکا رہی تھی۔ اطراف میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں، جن پر علاقے کے معزز افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار جی کوئی عام آدمی نہیں تھے۔ ان کے پاس کل پچیس دیہاتوں کی سرداری تھی۔ روزانہ ان کے حویلی نما محل میں کھلی کچہری لگتی تھی جہاں ان دیہاتوں کے لوگ اپنے اپنے مسائل، مصیبتیں اور مشکلات بیان کرتے تھے اور سردار جی موقع پر ہی ان سب کی راحت کا سامان کر دیتے تھے۔ یہ سرداری، سردار جی کو وراثت میں ملی تھی اور وہ عاجزی کے ساتھ اس فرض کو احسن طریقے سے سرانجام دے رہے تھے۔

پچھلے چند ہفتوں سے فضل دین کو ایک پریشانی لاحق تھی۔ اپنے گاؤں میں فضل دین ایک باغ کا مالی تھا۔ اس نے باغ کے مالک سے اپنی پریشانی بیان کی تھی مگر باغ کے مالک نے اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ فضل دین سارا سال باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ پھل مالک کا ہوتا تھا اور درختوں کے نیچے کھیت میں فضل دین جو سبزی وغیرہ کاشت کرتا تھا، اس سے ملنے والی آمدن فضل دین کی ہوتی تھی۔ اس کے اور باغ کے مالک کے درمیان اس معاہدے کے تحت ایک لمبے عرصے سے کام کا نظام ایسے ہی چل رہا تھا۔ اب فضل دین کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اخراجات میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ فضل دین کی آمدن سے گھر کا خرچ تو چل جاتا تھا لیکن اگر اچانک کوئی مالی مشکل آ جائے تو فضل دین بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اب فضل دین کو اپنی ایک ذمہ داری کا دکھ پریشان کر رہا تھا۔ ایسے میں فضل دین کو ڈوبتے میں تنکے کا سہارا ملا تھا۔ کسی نے اسے سردار حیات کی چوپال میں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ سردار حیات اپنی رعایا پر کتنا مہربان ہے اور آج فضل دین، سردار جی کے سامنے موجود تھا۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر فضل دین تو جیسے بولنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اپنا دکھ بیان کرے تو کیسے کرے..... ہمت جواب دے گئی تھی۔ کچہری کی کارروائی اپنے عروج پر تھی۔ سائل اپنی اپنی مشکلات بیان کر رہے تھے اور سردار جی موقع پر ہی سب کی تسلی کر رہے تھے۔ ان

کے فیصلے سن کر حاضرین واہ...... واہ کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام لوگ دربار سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایسے میں ایک آواز فضل دین کے کانوں سے ٹکرائی۔

''فضل دین...... کب سے بیٹھے ہو؟ اپنی مشکل، اپنا دکھ بیان نہیں کرو گے؟'' یہ سردار حیات کی آواز تھی۔ فضل دین گھبرا گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

''سردار جی...... آپ...... آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟'' سردار جی مسکرانے لگے، پھر وہ بولے۔

''فضل دین...... اگر ہمیں اپنی رعایا کے دکھ سکھ اور ناموں کا علم نہ ہو تو پھر ہماری سرداری کس کام کی؟'' فضل دین سردار حیات کے قدموں میں آ بیٹھا تھا۔

''میں غلام......'' وہ عاجزی سے بولا تھا۔

''نہیں...... تم ہمارے دوست ہو۔'' سردار جی نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ فضل دین کو سردار حیات سے اس سلوک کی توقع نہیں تھی۔ جب کسی غریب آدمی کو ''بڑوں'' کی محفل میں پیار ملتا ہے، احترام ملتا ہے تو وہ رو پڑتا ہے۔ فضل دین کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ اگلا لمحہ فضل دین کے لیے حیران کن تھا۔ سردار حیات کے ہاتھ میں کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ یہ پورا ایک لاکھ روپیہ تھا۔

''فضل دین پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹی کی شادی کرو...... پورے وقار کے ساتھ۔'' سردار حیات نے تو اسے اپنا دکھ سنانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ سردار جو اس کا نام جانتا تھا، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کے دکھ سے آگاہ نہ ہو۔ فضل دین نے لرزتے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی پکڑ لی تھی۔

''خبردار...... کوئی باپ اپنی بیٹی پر احسان نہیں کرتا۔ بس اپنا فرض ادا کرتا ہے۔'' اب تو بات بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ سردار جی نے فضل دین کی بیٹی کو اپنی بیٹی کہہ دیا تھا۔ اس نے سردار جی کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اس کے آنسو سردار جی کے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے۔ یہ آنسو اس کی طرف سے سردار جی کے لیے محبت اور عقیدت کا تحفہ تھے۔ اب وہ سردار جی کو خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر وہ ایک غریب آدمی تھا۔ ایک بڑے آدمی کو خوش کرنے کے لیے وہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔ اب وہ اس رُخ پر سوچنے لگا تھا۔ چوپال میں سے باہر نکلتے وقت وہ پہرے دار کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اسے ایک خیال آیا۔ وہ سردار جی کے احسان کا جواب احسان سے تو دینے کے قابل نہیں تھا مگر کچھ ایسا ضرور ہو سکتا تھا کہ جس کی وجہ سے سردار جی خوش ہو جائیں۔ اس کے لیے سردار جی کی پسند اور ناپسند کے حوالے سے ٹوہ لینا ضروری تھا۔ اس ٹوہ میں پہرے دار اس کی مدد کر سکتا تھا۔

''سردار جی کو کیا پسند ہے...... وہ ایسی کون سی چیز ہے کہ جسے دیکھ کر سردار جی خوش ہو جاتے ہیں۔'' اس نے پہرے دار سے پوچھا تھا۔ پہرے دار کے لیے یہ سوال انوکھا تھا، پھر بھی وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

''پھول...... گلاب کے پھول...... سردار جی کو گلاب کے پھول بہت پسند ہیں...... پھولوں کی مہک سے وہ مسرور ہو جاتے ہیں۔ ویسے تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اب پہرے دار نے سوال پوچھا۔

''میں سردار جی کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے چل پڑا۔ وہ عجیب خوشی اور مستی کی کیفیت میں تھا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر اس نے جو پہلا کام کیا، اسے دیکھ کر سب پہلے حیران ہوئے، پھر پریشان ہو گئے۔ اس نے باغ میں موجود سبزیوں کی فصل پر ہل چلا دیا۔ کھیت برابر کر کے اس نے نئی فصل کے لیے کھیت کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے کیاریاں بنائی تھیں اور گلاب کے پھولوں کی فصل تیار کرنے کے لیے پوری لگن کے ساتھ محنت کرنے لگا تھا۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے فضل دین اپنے خون سے کھیت کو سینچ رہا ہو۔ اس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ ہر فکر، ہر غم سے آزاد تھا۔ یاد تھا تو بس سردار جی کا احسان یاد تھا، ان کا ایثار یاد تھا۔ پھر فضل دین کی منزل قریب آ پہنچی۔ باغ میں گلاب کے پھولوں کا کھیت تیار ہو چکا تھا اور اب پودوں پر کلیاں لگ چکی تھیں۔ غنچے کھلنے لگے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے ساری فضا مہکنے لگی تھی۔ فضل دین نے گلاب کے پھولوں سے ٹوکری سجائی، یہ بہترین اور خوش بو دار گلاب تھے۔ پھر وہ سردار جی کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ سردار جی کی چوپال میں میلے کا سا سماں تھا۔ کھلی کچہری کا دور چل رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ آج سردار جی کے سامنے موجود گول میز خالی پڑی تھی۔ فضل دین چوپال میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے تازہ پھولوں کی مہک سردار جی تک پہنچ چکی تھی۔ سردار جی اچانک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی دیکھ کر

تمام لوگ بھی خاموش ہو گئے۔ فضل دین نے بہت احترام کے ساتھ پھولوں کی ٹوکری میز پر رکھ دی۔ سردار جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ان کے پیار اور ایثار کا جواب ایسے بھی دے سکتا ہے۔ فضل دین نے کسی سے کوئی بات نہیں کی، بس جھک کر سردار جی کو سلام کیا اور اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا، پھر محبت کے اظہار کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب یہ فضل دین کا معمول بن گیا۔ وہ روزانہ صبح سویرے اُٹھتا تھا۔ اللہ کی حمد و ثنا سے فارغ ہو کر وہ باغ میں چلا آتا تھا۔ کھلنے والے گلاب کے پھول وہ قینچی کی مدد سے کاٹ لیتا، پھر بے داغ پھولوں کی ٹوکری سجاتا۔ پھولوں کی یہ آراستہ ٹوکری سردار جی کی خدمت میں پیش کر کے باقی پھول ایک ٹوکرے میں دھر کر وہ بازار چلا آتا۔ سبزی فروش اب پھول فروش بن چکا تھا۔

''پھول لے لو پھول...... خوشیوں کی سوغات لے لو...... خوشبو کی مہکار لے لو...... روٹھے ہوؤں کو منا لو...... گلے میں پھولوں کے ہار...... ڈال لو، بھئی ڈال لو۔'' وہ طرح طرح کی انوکھی آوازیں لگاتا۔ خوشی ہو یا غم، پھولوں کی ضرورت ہر کسی کو پڑتی ہے۔ پھولوں کے زیور بھی خواتین بہت پسند کرتی ہیں۔ جب نیت اچھی ہو تو کام چل ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی فضل دین ایک قناعت پسند آدمی تھا۔ پھولوں کی فروخت سے گھر کا خرچ چلنے لگا تھا، پھر بہت سے دن گزر گئے۔

ایک دن فضل دین حویلی میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ آج کھلی کچہری کی چھٹی تھی۔ فضل دین نے پہرے دار سے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

''آج ایک معزز مہمان آنے والا ہے۔ اس کے اعزاز میں سردار جی نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر دی ہیں۔''

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' فضل دین واپس لوٹنے لگا تو پہرے دار نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''آج تم کہیں نہیں جا سکتے۔''

''کیوں...... کیا ہوا......؟'' فضل دین گھبرا گیا تھا۔

''وہ معزز مہمان تم ہی ہو...... چلو میرے ساتھ...... سردار جی یاد کر رہے ہیں۔'' فضل دین کی حیرت کا عالم دیکھنے والا تھا۔ وہ چل پڑا تھا مگر جانے کیوں اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ سردار جی اس کے منتظر تھے۔

''آؤ! فضل دین آؤ...... تم روز ہماری خدمت کرتے ہو، آج ہمارا دل چاہا کہ تمہاری خدمت کریں۔'' سردار جی پیار سے بولے۔

''سردار جی...... میں غلام......''

''نہیں، تم ہمارے دوست ہو! آؤ میرے ساتھ بیٹھو...... ہم ایک ساتھ ناشتا کریں گے۔'' سردار جی کی بات سن کر فضل دین تو لرز کر رہ گیا۔ کہاں سردار جی اور کہاں وہ...... اس کا دل پگھل گیا تھا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ کسی غریب کو جب پیار ملتا ہے، احترام ملتا ہے تو وہ رو پڑتا ہے۔

''شرماؤ مت...... آؤ...... بیٹھو میرے ساتھ۔''

"سردار جی...... میں...... میں......"

"چلو اب میں...... میں، مت کرو۔ بیٹھو میرے پاس...... تم دوست ہو ہمارے...... اور دوستوں کی جگہ برابر میں ہوتی ہے۔" سردار جی کی حوصلہ افزائی سے فضل دین جھجکتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بہت پُرلطف ناشتا تھا۔ کھانے کی بھوک کسے ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنے گھر میں کھا کر ہی سوتا ہے۔ بات ہوتی ہے پیار کی...... اپنے پن کی...... خوشی کی شدت سے فضل دین جھوم رہا تھا۔ گھر واپسی پر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ فضا میں پرواز کر رہا ہو۔ پھر وہ پھولوں کا ٹوکرا لے کر بازار پہنچ گیا۔ اس نے آواز لگائی۔

"پھول لے لو پھول......" آج اس لے میں مستی تھی، مسرت تھی۔ اس کے بازار کے دوستوں نے محسوس کر لیا تھا کہ آج فضل دین ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش ہے۔ سب اس کے پاس چلے آئے تھے۔

"کیا ہوا فضل دین...... آج بہت چہک رہے ہو؟"

"کچھ مت پوچھو دوستو...... اب بات بہت آگے بڑھ گئی ہے...... سردار حیات میرا دوست بن گیا ہے...... آج ہم نے ایک ساتھ ناشتا کیا ہے۔" فضل دین کی بات سن کر اس کے دوست کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

"کہاں تم...... اور کہاں سردار حیات...... بے وقوف بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملا کیا...... بات کرتا ہے سردار حیات سے دوستی کی۔"

"اللہ کی قسم...... سچ بولتا ہوں۔" فضل دین اپنی بات منوانے کے لیے قسمیں کھانے لگا۔ پھر سارا ماحول ہی بدل گیا۔ اس کے دوست ہی اسے طنزیہ جملوں کا نشانہ بنانے لگے۔ کوئی اب کی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ "بڑا آیا سردار حیات سے دوستی کا دعویٰ کرنے والا۔" فضل دین کے جذبات پر اوس پڑ گئی تھی۔

"پھول لے لو...... پھول۔" اب اس کی آواز میں وہ دم نہیں رہا تھا۔ اب بازار میں موجود اس کے دوستوں کے ہاتھ ایک نیا شوشا آ گیا تھا۔ ہنسی ہنسی میں انہوں نے فضل دین کا جینا مشکل کر دیا تھا۔ فضل دین کو آتا دیکھ کر وہ آوازیں کستے تھے۔

"وہ دیکھو...... سردار حیات کا دوست آ رہا ہے...... بڑے لوگ، بڑی باتیں...... چھوٹے لوگ، چھوٹی باتیں...... ہم پھولوں کے بیوپاری ہیں اور سردار حیات سے ہماری یاری ہے۔" ہر وقت طنز کے تیروں نے فضل دین کا کلیجہ زخمی کر دیا تھا۔ اب فضل دین کی آنکھوں سے نمی خشک نہیں ہوتی تھی۔

"پھول لے لو...... پھول۔" اب اس کی آواز میں وہ دم نہیں رہا تھا۔ وہ ہر وقت شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔

"پھول لے لو...... پھول۔" اس دن وہ بازار میں اپنے سامنے پھولوں سے بھرا ٹوکرا رکھے آواز لگا رہا تھا۔ اس کی آواز میں کوئی لے نہیں تھی۔ کوئی نغمگی نہیں تھی۔ کوئی شوخ پن نہیں تھا کہ اچانک کوئی پیچھے سے آیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی محسوس کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتا کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے، پھر ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"بوجھو تو بھلا میں کون ہوں؟" فضل دین کو تو کپکپی لگ گئی تھی۔ آواز سردار حیات کی تھی۔ سردار جی کے مخبروں نے ان تک اس معاملے کی خبر پہنچا دی تھی کہ کیسے فضل دین کے دوست اور بازار والے اسے تنگ کرتے ہیں۔ کیسے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے سردار جی خود چلے آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں کا لمس اپنی آنکھوں پر محسوس کر کے فضل دین میں ایک نئی جان آ گئی تھی۔ وہ جوش سے بولا۔ "پھول لے لو...... پھول۔"

"بتاؤ تو بھلا میں کون ہوں؟" سردار جی اس سے پوچھ رہے تھے۔ "پھول لے لو...... پھول۔" فضل دین کی آواز دُور تک جا رہی تھی۔ "...... پھول لے لو...... پھر نہ کہنا کہ خبر نہیں ہوئی۔" اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا ساون سردار جی کے ہاتھوں کو بھگو رہا تھا۔ بازار میں موجود تمام افراد کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

سردار جی کو سمجھ آ گیا تھا کہ ایک غریب آدمی کہاں سے بول رہا ہے۔ "آج اگر پھول نہ خریدے تو بہت پچھتاؤ گے دوستو۔" اب سردار جی نے اس کی آنکھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا دیئے اور پھر وہ فضل دین کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "سب سن لیں...... فضل دین ہمارا دوست ہے اور ہم فضل دین کے دوست ہیں۔" فضل دین کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنسوؤں کی وجہ سے سارا منظر دھندلا کر رہ گیا تھا اور اب سب کو سمجھ آ چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سردار جی کو سرداری کیوں دی تھی۔ وہ اللہ کی مخلوق کو خوش رکھتے تھے اور اللہ اپنی خاص رحمت سے انہیں خوش رکھتا تھا۔ محبتوں کی کھیتی کرنے والے ہمیشہ محبتوں کی فصل کے ہی مستحق ہوتے ہیں اور گلاب کی خوشبو کی طرح مہکتے رہتے ہیں۔ ☆☆☆

سچ کہہ دوں اے برہمن ! گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

☆

ہم تو آسمانوں میں ڈھونڈتے رہے اس کو
مگر وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب نکلا

(احسن جاوید)

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

(محمد حماس صارم، لاہور)

منزل کی جستجو میں کیوں بھٹک رہا ہے راہی
اتنا عظیم ہو جا کہ منزل تجھے پکارے

(معتصم الٰہی، شیخوپورہ)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے مری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(حافظہ ام حبیبہ، لاہور)

بس اسی بات پہ خفا ہے ہم پہ گردشِ وقت
ہم نے سیکھے نہیں انداز زمانے والے !

(انعام اللہ چوہان، کھاریاں)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

☆

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

دُنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم سہتا ہے، بغاوت نہیں کرتا

ایک حقیقت ہی سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسن انسان سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

(جنید کریم، گجرات)

اپنے لہو سے روشن کر دیں گلیاں اس ویرانے کی
اگرچہ تنگ تھیں گلیاں شہرِ وفا کو جانے کی

(شازیہ ہاشم، کھڈیاں خاص)

عروسِ سلطنت کے منہ پہ رونق جس سے آتی ہے
شہیدوں کے جمال افزا لہو کا غازہ ہوتا ہے

(نجم السحر، ملک وال)

کچھ نہ کہنے سے بھی چھن جاتا ہے اعزازِ سخن
ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

(بشریٰ بیبل، کلورکوٹ)

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

(مہک خالد شیخ، لاہور)

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(عاتکہ رحیم، جوہر آباد)

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

(فائزہ رزاق، خانیوال)

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

(ثمر فاطمہ، کراچی)

☆☆☆

اپنے باپ کی یہ بات سن کر بھی نوجوان نے اپنی ضد نہ چھوڑی، آخر کار بوڑھے باپ کو اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور وہ ڈرتا، جھجکتا، سہما ہوا زمیندار کی حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا اور زمیندار سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زمیندار نے اسے اندر بلا لیا۔ زمیندار کو دیکھتے ہی وہ بوڑھا روتا، بلکتا اس کے قدموں میں گر گیا اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

''اے بزرگ! کیا مسئلہ ہے؟ صاف صاف بتایئے تاکہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔'' زمیندار نے نرمی سے پوچھا۔

''حضور! میرا بیٹا بڑا نادان ہے۔ اگر آپ مجھے اور اس کو معاف کر دیں تو میں عرض کروں کہ وہ آپ کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند ہے۔''

بوڑھے کی بات سنتے ہی زمیندار کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر پھر اس نے اپنے غصے کو دبا لیا اور نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔

''اے بزرگ! تمہارا بیٹا کیا کاروبار کرتا ہے؟''

''حضور! وہ ایک بہترین چور اور اعلیٰ قسم کا ٹھگ ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کو لوٹ لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' اس کے بعد اس نے اپنے نوجوان بیٹے کی ساری کہانی زمیندار کو سنا دی جسے سن کر زمیندار بوڑھے کی سچائی سے بہت متاثر ہوا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''اے بزرگ..... جا کر اپنے بیٹے سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ اپنے فن میں اتنا ہی طاق ہے تو میں پہلے اس کا امتحان لوں گا۔ اگر اس میں وہ کام یاب ہو گیا تو پھر میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔''

''کیسا امتحان......؟'' بوڑھے نے حیرت سے پوچھا۔

''امتحان یہ ہے کہ پرسوں دوپہر کو ہمارے گھر میرے ایک تاجر دوست کی دعوت ہے۔ اس کے لیے ایک سالم بکرا بھونا جائے گا۔ اگر تمہارا بیٹا ہمارے باورچی خانے سے یہ بھنا ہوا بکرا اُٹھا لے جانے میں کام یاب ہو گیا تو پھر میں اس شادی کے لیے سوچوں گا۔''

زمیندار کی یہ شرط سن کر بوڑھا چپ چاپ اپنے گھر واپس آ گیا اور اپنے بیٹے کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ساری بات سن کر وہ نوجوان بالکل بھی پریشان نہ ہوا بلکہ شرط پوری کرنے میں جُت گیا۔

اس نے جنگل سے خوب پلے ہوئے تین جنگلی خرگوش زندہ پکڑے اور ان کو ایک تھیلے میں بند کر لیا۔ اس کے بعد دعوت والے

دن اس نے بھیس بدلا اور اپنا حلیہ ایک ایسے بوڑھے فقیر کا بنایا جسے دیکھتے ہی سب کو اس پر ترس آ جائے۔ اس کے بعد دوپہر کے وقت وہ زمیندار کی حویلی کے عقبی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے خرگوشوں والا تھیلا اپنے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ اس وقت زمیندار اپنے ملازمین کے ساتھ باورچی خانے میں موجود تھا اور بکرا بھوننے کی نگرانی کر رہا تھا۔ موقع دیکھ کر نوجوان نے ایک خرگوش حویلی کے اندر چھوڑ دیا جو ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔

''ارے...... دیکھو کتنا خوب صورت اور پلا ہوا خرگوش ہے۔ پکڑو اس کو بھی پکاتے ہیں۔'' باورچی خانے میں موجود لوگ اس خرگوش کو پکڑنے دوڑے۔

''ارے، اس کے پیچھے مت جاؤ۔ سب لوگ واپس آ جاؤ۔'' زمیندار چلایا تو سب لوگ خرگوش کو چھوڑ کر واپس باورچی خانے میں آ گئے اور اپنے کام میں لگ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے دوسرا خرگوش بھی حویلی کے اندر چھوڑ دیا۔ جب اس نے بھی اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کیا تو باورچی خانے میں موجود لوگ دو موٹے تازے خرگوش دیکھ کر رہ نہ سکے اور ایک بار پھر ان کو پکڑنے دوڑے۔ زمیندار نے دوبارہ ان کو سختی سے روکا۔ کام بنتا نہ دیکھ کر نوجوان نے تھوڑی دیر بعد تیسرا خرگوش بھی حویلی کے اندر پھینک دیا۔ وہ بھی ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔ باورچی خانے کے ملازمین نے جب دیکھا کہ عقبی باغ میں تین تین موٹے تازے خرگوش کھیل کود رہے ہیں تو اب وہ رہ نہ سکے اور ان کے پیچھے لپکے۔ اب زمیندار کی بھی رال ٹپکی اور وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ جب سارے لوگ خرگوش پکڑنے میں مصروف تھے تو نوجوان چپکے سے باورچی خانے کے اندر گھسا اور بھنا ہوا بکرا اُٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خرگوش بھی شکاریوں کے ہاتھ سے بچ کر جنگل کی طرف بھاگنے میں کام یاب ہو گئے۔ سب لوگ ناکام ہو کر جب واپس لوٹے تو دیکھا کہ بکرا غائب ہو چکا تھا۔ زمیندار کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ شرط ہار گیا تھا اور نوجوان کام یاب ہو چکا تھا۔

اس دن زمیندار نے اپنے جس تاجر دوست کو کھانے پر مدعو کیا تھا، جب وہ دعوت میں پہنچا تو زمیندار نے اس کو ساری حقیقت بتا دی کہ کیسے ایک نوجوان بکرا چرا کر لے گیا ہے۔ اس کی ساری بات سن کر اس کا تاجر دوست بہت حیران ہوا اور بولا۔

''تم اتنے چالاک ہونے کے باوجود کیسے اس نوجوان کی چال میں پھنس گئے۔ مجھے تو کوئی اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔''

''ایسا مت بولو۔ وہ نوجوان اتنا شاطر ہے کہ کسی کو بھی آسانی سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔'' زمیندار نے خفگی بھرے لہجے میں کہا مگر اس کا تاجر دوست اس سے بالکل بھی متفق نہ ہوا اور اس کا مذاق اُڑاتا رہا کہ وہ کیسے بے وقوف بن گیا ہے۔ شام کو نوجوان زمیندار کی حویلی پہنچا اور کہنے لگا۔

''میں نے اپنا فن ثابت کر دیا ہے، اب آپ اپنے وعدے کے مطابق اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں۔''

نوجوان کی یہ بات سن کر زمیندار کہنے لگا۔

''میرے پاس میرا ایک تاجر دوست آیا ہوا تھا جس کے کھانے کو تم اُڑا لے گئے تھے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کو دھوکہ دینا مشکل ہے۔ اگر تم اس کا غرور توڑ دو تو مجھے خوشی ہو گی اور میں اپنا وعدہ بھی پورا کر دوں گا۔''

''یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔'' نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''جو میرے فن کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اسے سبق ضرور ملنا چاہیے۔ آپ مجھے صرف اس کا نام اور پتا بتا دیجیے۔''

زمیندار نے اس نوجوان کو اپنے تاجر دوست کے گھر کی نشان دہی کر دی۔ اس کے بعد نوجوان نے گھر جا کر ایک بڑی سی سفید چادر اپنے اوپر اوڑھی اور بطخوں کے بہت سارے پَر لے کر اپنے کندھوں پر چپکا لیے۔ پھر وہ تاجر کے گھر کو جانے والے راستے پر ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ جب وہ تاجر رات کو واپس اپنے گھر آ رہا تھا تو نوجوان نے آواز بدل کر اس کا نام پکارا۔

''یہ کون مجھے بلا رہا ہے؟'' تاجر نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میں ایک فرشتہ ہوں......'' نوجوان سامنے آتے ہوئے بولا۔

''میں آسمان سے آیا ہوں تاکہ تمہارے نیک کاموں کے بدلے میں تمہیں زندہ ہی جنت میں پہنچا دوں۔ کل شام تم تیار رہنا، میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ تم اپنے ساتھ سونا چاندی اور نقد رقم بھی لے جا سکتے ہو جو تم نے اپنے گھر میں جمع کر رکھی ہے۔ اور ہاں! کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا، ورنہ وہ بھی تمہارے ساتھ جانے کی ضد کریں گے جس کی وجہ سے تم بھی نہیں جا سکو گے۔''

سفید چادر اور کندھوں پر لگے پَروں کی وجہ سے وہ تاجر اس نوجوان کو ایک فرشتہ ہی سمجھا اور اس کی باتوں پر یقین کر بیٹھا۔ فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

دوسری شام اس نے اپنا سب قیمتی سامان ایک بوری میں جمع کیا اور فرشتے کی مقررہ جگہ پر پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نوجوان بھی فرشتے کے بھیس میں وہاں آ گیا۔ آتے ہی اس نے تاجر کو ایک بوری تھمائی اور اس کے اندر گھسنے کا حکم دیا۔ تاجر نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ نوجوان نے اس بوری کا منہ ایک رسّی کی مدد سے باندھ دیا اور قیمتی سامان والی دوسری بوری اس نے اپنے کندھے پر لاد لی۔ اس کے بعد وہ تاجر والی بوری کو بے دردی سے زمین پر گھسیٹتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔

''ارے میں مر گیا..... ارے میں مر گیا..... تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' تاجر درد کے مارے بُری طرح چیخنے لگا۔

''یہ جنت کو جانے والا ایک قریبی راستہ ہے۔ تھوڑا سا تنگ ہے، اس لیے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ صبر کرو! ہم ابھی پہنچ جائیں گے۔'' نوجوان نے اسے تسلی دی۔

نوجوان اس کو بے دردی سے زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا اور تاجر کو اپنی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں مگر جنت جانے کے لالچ میں وہ سب برداشت کر رہا تھا۔ آخر کار وہ نوجوان اس کی بوری کو لے جا کر زمیندار کے بطخوں والے باڑے میں پھینک آیا۔ ساری رات بطخیں اسے اپنی چونچ سے کاٹتی رہیں، یہاں تک کہ وہ بے چارہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ نوجوان جاتے ہوئے اس کی ساری دولت بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دوسری صبح جب بطخوں کی صفائی کرنے والی ملازمہ وہاں آئی تو ایک بوری کو وہاں پڑے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بوری کے اندر تاجر درد کی شدّت سے کراہ رہا تھا۔ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے بوری کا منہ کھولا تو اندر ایک انسان کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔

''اوہ میرے خدا..... تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ملازمہ نے پوچھا۔

''اگر تم کوئی فرشتہ ہو اور یہ جنت ہے تو مجھے یہاں سے نکالو اور واپس زمین پر پہنچا دو۔ میں وہیں خوش ہوں۔ یہاں یہ چھوٹے شیطان مجھے اپنی تلواروں سے مار رہے ہیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''خدا تمہاری مدد کرے..... میں فرشتہ ہوں، نہ یہ جنت ہے بلکہ یہ تو زمیندار کی بطخوں کا باڑہ ہے۔'' ملازمہ نے اسے بوری سے باہر نکالتے ہوئے بتایا۔

بے چارہ تاجر بوری سے باہر نکلا تو اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ آس پاس کا ماحول دیکھتے ہی اس کو ساری بات سمجھ آ گئی اور وہ کہنے لگا۔

''میں سمجھ گیا۔ یہ سب اسی ٹھگ کا کیا دھرا ہے جس نے زمیندار کو بھی دھوکہ دیا تھا۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اپنی دولت والی بوری نظر نہ آئی تو وہ بُری طرح رونے پیٹنے لگا۔ اس کا شور سن کر زمیندار بھی وہاں آ گیا۔ جب اس کو سارا ماجرا معلوم ہوا تو وہ بُری طرح ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔

''اب تو مانتے ہو ناں کہ وہ نوجوان شیطان کی طرح چالاک ہے۔ وہ کسی کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔''

اس کے بعد اس نے تاجر کی مرہم پٹی کی اور اس کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ شام کو جب نوجوان زمیندار کے پاس پہنچا اور شادی کے وعدہ پر اصرار کیا تو زمیندار بولا۔

''نوجوان! تم واقعی اپنے فن کے ماہر ہو اور لوگوں کو بہت عمدہ دھوکہ دے سکتے ہو مگر میں ایک دفعہ اور تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ سنو! میرے اصطبل میں بارہ شان دار گھوڑے کھڑے ہیں، میں آج رات ان میں سے ہر ایک پر ایک سوار بٹھا دوں گا۔ اگر تم عمدہ چور ہو تو ان سواروں کے نیچے سے گھوڑے نکال لے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں یہ آپ کی یہ شرط بھی پوری کر دوں گا۔'' نوجوان بولا۔ ''مگر اس کے بعد آپ کو اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے! تم بے فکر رہو، اگر تم کام یاب ہو گئے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔'' زمیندار نے اسے تسلی دی۔

زمیندار کے گھر سے نکل کر وہ نوجوان سیدھا بازار پہنچا اور وہاں سے نیند کی دوا خریدی، گھر واپس آیا اور قہوہ تیار کر کے ان کو دو بوتلوں میں بھر لیا۔ ایک میں اس نے نیند کی دوا ملا دی جب کہ دوسری کو ویسے ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد اس نے گیارہ مزدور کرائے پر لیے اور ان کو رات کے وقت زمیندار کے اصطبل کے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ خود اس نے ایک پھٹا پُرانا لباس لیا اور اس کو پہن کر اپنا حلیہ ایک غریب بڑھیا کا سا بنایا۔ ایک عصا ہاتھ میں

پکڑا، گٹھڑی کندھے پر لادی اور شام کے وقت لنگڑاتا ہوا زمیندار کے اصطبل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہاں ملازمین گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے اور ان کے سامنے چارہ ڈال رہے تھے۔

''اے بڑھیا! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ بھاگو یہاں سے......'' ایک ملازم اسے دیکھتے ہی غصے سے چلا اُٹھا۔

''بیٹا! باہر بہت سردی ہے، میں مر جاؤں گی۔ مجھے اصطبل کے اندر تھوڑی دیر پناہ لینے دو۔'' بڑھیا نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

''بالکل بھی نہیں...... یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔ اگر زمیندار کی نظر تم پر پڑ گئی تو وہ ہم سب کو کڑی سزا دے گا۔'' اس ملازم نے جواب دیا۔

قریب ہی کھڑا ایک اور ملازم کچھ نرم دل محسوس ہوتا تھا، اس کو بڑھیا پر ترس آ گیا، اس لیے وہ پہلے ملازم سے کہنے لگا۔

''ارے، اس بے چاری بڑھیا کو کچھ دیر اندر آ کر آرام کر لینے دو، اس سے ہمیں کیا نقصان ہو سکتا ہے۔''

اس دوران دوسرے ملازم بھی اس کی بات سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب آپس میں بحث کرنے لگے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اس بڑھیا کو کچھ دیر آرام کر لینے دیا جائے جب کہ کچھ اس کے خلاف تھے۔ جب وہ آپس میں بحث کر رہے تھے تو بڑھیا نظر بچا کر اصطبل کے اندر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو زمیندار کے حکم کے مطابق کام مکمل کر کے گھوڑوں پر زینیں ڈالیں گئیں اور پھر ان پر سوار جم کر بیٹھ گئے۔

''خدا کی پناہ کس قدر سردی ہے۔'' ایک سوار کانپتے ہوئے بولا۔

''ہاں! میرے تو دانت بھی بج رہے ہیں۔ کاش! کچھ گرم قہوہ مل جائے۔'' دوسرا بولا۔

اسی وقت بڑھیا نے اپنی قہوے والی بوتل نکالی اور اس کو اچھی طرح ہلا کر اس میں سے ایک گھونٹ پیا۔

''اے بڑھیا! یہ تمہاری بوتل میں کیا ہے جو تم پی رہی ہو؟'' ایک اور سوار نے سوال کیا۔

''یہ مجھ بے چاری بڑھیا کے لیے تھوڑا سا گرم قہوہ ہے۔'' بڑھیا نے سردی سے کانپتے جواب دیا۔

''ارے قہوہ ہے...... ہمیں بھی تھوڑا پلاؤ۔'' قہوے کا نام سنتے ہی بارہ کے بارہ سوار ایک ساتھ چلا اُٹھے۔

''مگر...... یہ تو بہت تھوڑا ہے، اس سے تو تمہارا حلق بھی تر نہیں ہو گا۔'' بڑھیا نے ہولے سے جواب دیا مگر جب وہ اصرار کرنے لگے تو بڑھیا نے اپنے تھیلے سے نیند کی دوا والی بوتل نکالی اور ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ سب نے اس میں سے ایک ایک گھونٹ پیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ ہر کوئی ایک ایک گھونٹ پی کر بوتل آگے بڑھاتا رہا، حتیٰ کہ بارہ کے بارہ وہ قہوہ پی گئے۔ جب آخری سوار بھی پی چکا تو نیند کی دوا نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا اور ان کے خراٹے اصطبل میں گونجنے لگے۔ نوجوان نے بڑھیا کا روپ اُتار پھینکا اور سب سواروں کو ایک ایک کر کے گھوڑوں سے نیچے اُتار کر ان کو ستونوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گیارہ مزدوروں کو آواز دے کر اندر بلایا اور وہ سب زمیندار کے بارہ گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے نکل گئے۔ (بقیہ آئندہ)

خالد جتنا ذہین اور عقل مند تھا، اتنا ہی شریر اور من چلا بھی تھا۔ بچے تو بچے بڑے بھی اس کے منہ لگتے گھبراتے تھے۔ محلے والے اسے ''شیطان کا باپ'' کہا کرتے اور کوئی اسے پاس تک نہ پھٹکنے دیتا۔ بچوں اور بڑوں کو چھیڑتے چھیڑتے اُکتا جاتا تو غلیل لے کر کسی باغ میں نکل جاتا اور ننھی ننھی چڑیوں کو مار کر دل بہلاتا۔ کسی درخت پر کسی پرندے کا گھونسلا نظر آ جاتا تو جب تک اسے توڑ پھوڑ کر پھینک نہ دیتا، تب تک اسے چین نہ آتا۔ گھر میں چڑیاں یا کبوتر گھونسلے بنا لیتے تو بے چاروں کی شامت ہی آ جاتی۔ کمہاروں کے گدھے تو اس کی صورت دیکھتے ہی کانپ جاتے۔ کوئی بدنصیب گدھا میاں خالد کے ہتھے چڑھ جاتا تو اس کی ایسی درگت بناتے کہ وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے سارا آسمان سر پر اُٹھا لیتا۔ خالد کا خیال تھا کہ یہ بے زبان جانور اللہ میاں نے پیدا ہی اس لیے کیے ہیں کہ ان سے جس طرح کا دل چاہے سلوک کیا جائے اور جیسا جی چاہے، مارا پیٹا جائے۔

ایک دن میاں خالد اسکول سے آئے تو طبیعت ذرا ست تھی۔ سوچنے لگے کس طرح دل بہلایا جائے۔ چڑیوں کا شکار کرتے کرتے دل بھر چکا تھا اور پھر یہ کم بخت چڑیاں ہوشیار اتنی ہو گئی تھیں کہ صورت دیکھتے ہی پھر سے اُڑ جاتیں۔ پیڑوں پر پرندوں کے گھونسلے بھی ختم ہو چکے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے میدان میں پہنچے۔ سامنے ایک مریل سا گدھا گھاس چر رہا تھا۔ گدھے کو دیکھ کر کھل کھلا اُٹھے۔ چپکے سے پاس پہنچے اور گردن پکڑ کر رسّی سے منہ خوب جکڑ کر باندھ دیا۔ بے چارا گدھا اتنا کمزور اور دبلا پتلا تھا کہ چپ چاپ کھڑا اپنی درگت بنواتا رہا۔ منہ باندھنے کے بعد آپ اُچک کر اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھے اور رسّی کھینچ کر بولے۔ ''ہاں! بیٹا چلو، ذرا کھیتوں کی سیر ہو جائے۔ بہت دنوں سے سواری کے لیے ترس رہے تھے۔ ٹخ ٹخ ٹخ۔''

گدھے نے دیکھا کہ بن چلے چھٹکارا نہیں تو غریب آہستہ آہستہ چلنے لگا مگر خالد کو اس کی سست چال بڑی بُری معلوم ہوئی۔ زور سے رسّی کھینچی اور لات مار کر بولا۔ ''ہوں! کم بخت! مُردوں کی سی چال چلتا ہے۔ ابے ذرا چال دکھا چال...... ہاں ایسے، اور تیز۔ اچھا! ٹھہر جا، ایسے نہیں مانے گا۔'' یہ کہہ کر نیچے اُترا اور ایک پیڑ سے موٹا سا ڈنڈا توڑ کر جو گدھے پر پیلنا شروع کیا ہے تو میاں گدھے کے چیں بول گئے۔ ایک تو بے چارا ویسے ہی ادھ موا ہو رہا تھا۔ ڈنڈے کھا کر اور بھی بے حال ہو گیا۔ جیسے تیسے ہو سکا،

بھاگا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ زخمی پیٹھ پر میاں خالد جمے بیٹھے تھے۔ تکلیف کے مارے بلبلا اُٹھا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ خالد بولا۔ ''ہوں تو اب بہانے ہو رہے ہیں؟ ٹھہر جا نامعقول۔ اگر مارتے مارتے چمگادڑ نہ بنا دیا تو میرا نام خالد نہیں۔'' یہ کہہ کر سڑاک سڑاک دس پندرہ ڈنڈے اس کے منہ پر جما دیئے لیکن گدھا ٹس سے مس نہ ہوا۔ کھڑا کھڑا مار کھاتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو اس نے خالد کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''تو کس قدر پتھر دل اور ظالم ہے۔ مرتے کو مارنا کہاں کی انسانیت ہے؟ خدا کے لیے میرے اوپر رحم کر اور مجھے چھوڑ دے۔''

خالد رحم کے معنی بھی نہیں جانتا تھا۔ جانور ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ انہیں مار مار کر خوب دل کی بھڑاس نکالی جائے۔ غصے سے بولا۔ ''دیکھ! اب سیدھی طرح چلتا ہے تو چل، ورنہ مارتے مارتے حلیہ بگاڑ دوں گا۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ گدھے کی ذات بڑی بے وقوف اور ذلیل ہوتی ہے۔ یہ ڈنڈوں سے ہی مانتی ہے۔''

گدھے نے گردن پھیر کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''گدھا میں نہیں، تم ہو۔''

گدھے کو بولتا دیکھ کر خالد بھونچکا رہ گیا۔ آج تک اس نے کسی جانور کو ایسی صاف اُردو بولتے نہیں سنا تھا۔ گھبرا کر نیچے اُتر آیا اور ہکلا کر بولا۔ ''تو تو بولتا بھی ہے۔''

گدھے نے آہستہ سے سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''کیا کروں پھر؟ بولنا ہی پڑا۔ میں بوڑھا کمزور، بیمار جانور۔ چلنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ مالک نے گھر سے نکال دیا اور اب آپ بجائے اس کے کہ میرے اوپر ترس کھائیں، اُلٹا ظلم کر رہے ہیں۔ کاش! آپ بھی میری طرح جانور ہوتے، پھر آپ کو پتا چلتا کہ ہم بے زبانوں میں بھی جان ہوتی ہے اور ہم بھی دکھ درد اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح انسان۔'' یہ کہہ کر گدھا ایک طرف کو لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا اور میاں خالد سر کھجاتے ہی رہ گئے۔

''بدتمیز! نامعقول۔'' خالد چلتے چلتے بڑبڑا کر بولا۔ ''اب کے تو یہ مجھے چکمہ دے گیا۔ خیر پھر بھی تو بچے کبھی پھنسے گا۔ ساری کسر نکال لوں گا۔ حیرت ہے کہ اس گدھے کے بچے نے اُردو بولنی کہاں سے سیکھی؟ تعجب!''

سامنے سے شرفو کمہار بڑا سا ڈنڈا پکڑے لپکتا جھپکتا آرہا تھا۔ جب وہ خالد کے قریب پہنچا تو پانچ سات ڈنڈے اس کے جما دیئے اور غصے سے بولا۔ ''کام چور، نمک حرام۔ کام سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ رسّی تڑا کر بھاگ آیا۔ برتن تیرا باپ بازار سے لے کر جائے گا۔ چل تو گھر ایسی مرمت کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھے۔''

خالد کو بڑا غصہ آیا۔ ''یہ گنوار اور اسے مارے؟ آئیں جانتا نہیں کہ اس کا باپ تھانیدار ہے۔'' پیٹھ سہلا کر بولا۔ ''نالائق! تیری اتنی جرأت کہ تو میرے اوپر ہاتھ اُٹھائے۔ ابا سے کہہ کر حوالات کرا دوں گا۔ تو نے مجھے گدھا سمجھ رکھا ہے، جو میں برتن لے کر بازار جاؤں۔''

شرفو نے لال لال دیدے دکھائے اور خالد کے منہ پر ڈنڈا مار کر بولا۔ ''اب کھڑا ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا ہے۔ کھانے کو شیر اور کام کو بھیڑ...... چل مردار۔'' اس نے لپک کر خالد کا کان پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا گھر لے گیا۔ خالد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کیا شرفو پاگل ہو گیا ہے یا وہ ہی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ جتنا اس کے قبضے سے نکلنے کی کوشش کرتا، اتنے ہی شرفو اس کی پیٹھ پر ڈنڈے مارتا۔ پٹتے پٹتے خالد کی پیٹھ لہولہان ہو گئی اور اسے غش سا آنے لگا۔

گھر لے جا کر شرفو نے اس کی پیٹھ پر ایک بورا رکھ دیا اور اس میں بہت سے برتن بھر دیئے۔ اف اتنا بوجھ! اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ شرفو نے پندرہ بیس ڈنڈے اور رسید کیے اور اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ خالد کی نظروں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے اور وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ ''اے خدا! کیا میں سچ مچ گدھا بن گیا ہوں۔ یہ تو نے کیا کر دیا پروردگار؟'' برتن لاد کر شرفو نے پیچھے سے ایک ڈنڈا مارا اور ڈانٹ کر بولا۔ ''چل اب سیدھی طرح۔''

وہ روتا دھوتا قسمت کو کوستا چلا جا رہا تھا۔ پیٹھ پر من بھر بوجھ لدا تھا۔ اگر ذرا بھی کسمساتا یا رُکنے کا ارادہ کرتا تو شرفو ایسی بے دردی سے مارتا کہ نانی یاد آ جاتی۔

چلتے چلتے وہ ایک برتنوں کی دُکان پر پہنچے۔ شرفو ٹھہر گیا اور دُکان دار سے مول تول کرنے لگا۔ سودا ہو چکنے کے بعد اس نے پیسے لیے اور برتن خالد کی پیٹھ سے اُتار کر دُکان میں رکھ کر بولا۔ ''میں ذرا سامنے والی مسجد میں پانی پی آؤں۔ تم میرے گدھے کو دیکھتے رہنا۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' یہ کہہ کر وہ مسجد کی طرف چلا۔ خالد نے سوچا۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آنے کا۔ خیر چاہتے ہو تو بھاگ نکلو۔

اس نے جھٹکا دے کر بورا نیچے پھینک دیا اور بے تحاشا بھاگنے لگا۔ بھاگم بھاگ، بھاگم بھاگ چلا جا رہا تھا۔ سرپٹ، اندھا دھند۔ پیچھے شرفو ڈنڈا گھماتا آ رہا تھا۔ ''پکڑنا پکڑنا، یہ میرا گدھا ہے، پکڑنا!'' بائیں طرف موڑ تھا اور اس کے کنارے پر بجلی کا کھمبا۔ خالد جلدی سے جو مڑا تو اس کا سر بڑی زور سے کھمبے سے ٹکرایا اور ...... وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ امی جان سرہانے کھڑی کہہ رہی تھیں۔ ''شاباش بیٹا! صد رحمت۔ آج تو تُو مُردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ نو بج رہے ہیں اور تُو ابھی تک سویا پڑا ہے۔''

خالد نے آنکھیں جھپک کر امی جان کو دیکھا اور پھر اپنے آپ کو۔ ''ارے تو کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟'' لاحول پڑھ کر اُٹھ بیٹھا مگر شرفو کے ڈنڈے کا خوف ابھی تک اس کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ اس کا چھوٹا بھائی ننھی ڈنڈا لیے ایک مرغی کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور مرغی اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ خالد ڈانٹ کر بولا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو ننھی؟ شرم نہیں آتی، بے زبانوں کو تنگ کرتے؟ اور جو میں تمہیں اس طرح پریشان کروں تو؟''

اس دن سے میاں خالد بڑے رحم دل اور خدا ترس ہو گئے ہیں۔ کسی جانور کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ کبھی وہ کسی شخص کو، کسی جانور کو مارتا دیکھ لیتے ہیں تو چیخ کر کہتے ہیں۔ ''ارے ظالم! غریب بے کس جانور کو کیوں مارتا ہے، خدا سے ڈر۔ اگر تو بھی اس کی طرح بے بس اور مجبور ہوتا، تب تجھے عافیت معلوم ہوتی۔''

اب میاں خالد ننھے ننھے پرندوں کو مارنے کی بجائے انہیں دانہ دنکا کھلاتے ہیں۔ اگر کسی فاختہ یا چڑیا کے گھونسلے سے کوئی انڈا یا بچہ گر پڑتا ہے تو پیڑ پر چڑھ کر اسے گھونسلے میں رکھ دیتے ہیں۔ لوگ حیران ہیں کہ خالد میں ایسی تبدیلی کیسے ہو گئی۔ انہیں کیا پتا کہ یہ سب کچھ شرفو کے ڈنڈے کی کرامت ہے۔ ☆☆☆

حاتم سے بڑا رتبہ

کسی نے حاتم طائی سے سوال کیا کہ آپ نے دُنیا میں کسی کو اپنے آپ سے بھی زیادہ سخی پایا؟ حاتم نے جواب دیا۔ ''ہاں! ایک لکڑ ہارے کو۔ ایک بار میں نے اپنے مہمانوں کے لیے چالیس اونٹ ذبح کیے۔ دعوتِ عام تھی۔ جو آتا تھا، پیٹ بھر کر جاتا تھا۔ اس دن میں کسی ضرورت سے جنگل کی طرف گیا تو وہاں ایک لکڑ ہارے کو دیکھا جو خشک لکڑیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو آج یہ مشقت کیوں اُٹھا رہا ہے؟ حاتم کے گھر کیوں نہیں جاتا؟ وہاں تجھے بہترین کھانا ملے گا۔'' لکڑ ہارے نے میری یہ بات سن تو بے پروائی سے جواب دیا۔ ''جو شخص اپنی محنت سے اپنی خوراک حاصل کر سکتا ہے، وہ حاتم طائی کا احسان کیوں اُٹھائے۔''

پیارے بچو! اس حکایت میں محنت اور خودداری کی عظمت ظاہر کی ہے۔ حاتم طائی جو ہر دل عزیزی اور کارِ خیر میں بہت بڑا درجہ رکھتا تھا اور اپنی اس عظمت سے آگاہ بھی تھا، جب خوددار اور محنتی لکڑ ہارے سے ملا تو اسے اس کے مقابلے میں اپنی ذات حقیر نظر آئی۔ ......☆

ٹیچر: ''ندیم صبح سویرے اُٹھا کرو، اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ دیکھو جو چڑیا صبح سویرے اُٹھتی ہے، ان کو کیڑے مکوڑے کھانے کو مل جاتے ہیں۔''

ندیم: ''میڈم جی! جو کیڑے صبح سویرے اُٹھتے ہیں، ان کو جلدی اُٹھنے کی سزا بھی تو مل جاتی ہے۔'' (مائرہ حنیف، بہاول پور)

اُستاد (شاگرد سے): ''ہوا سے باتیں کرنا، کو جملے میں استعمال کرو۔''

شاگرد: ''کل میرے دو دوست سیر کو گئے۔ ان کے واپس آنے تک میں ہوا سے باتیں کرتا رہا۔'' ☆☆

اُستاد (جغرافیہ پڑھاتے ہوئے): ''بچو! سونا کان سے نکلتا ہے۔''

شاگرد: ''اچھا! اچھا! اب میں سمجھا کہ آپ بار بار ہمارے کان کیوں کھینچتے ہیں۔'' ☆☆

ایک آدمی (پہلوان سے): ''تم ایک وقت میں کتنے آدمی اُٹھا سکتے ہو؟''

پہلوان: ''دس آدمی۔''

آدمی: ''تم سے تو مرغا ہی اچھا ہے جو صبح صبح پورے محلے کو اُٹھاتا ہے۔'' (اسامہ احمد، گجرات)

مجسٹریٹ: ''تم مجھے دوٹوک جواب دو، تم نے جرم کیا ہے یا نہیں؟''

ملزم: ''جناب! اگر فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے تو آپ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟'' ☆☆

ایک شخص دُکان میں داخل ہوتے ہوئے بولا: ''ڈاکٹر صاحب! مجھے چشمے کی ضرورت ہے۔''

دُکان دار: ''واقعی! آپ کو نئے چشمے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ عینکوں کی نہیں، مٹھائی کی دُکان ہے۔'' (صالحہ کاردار، سیال کوٹ)

ایک عورت (سبزی والے سے): ''اگر سبزی خراب نکلی تو پکی پکائی واپس کر دوں گی۔''

سبزی والا: ''اگر ہو سکے تو ایک دو روٹیاں بھی ساتھ لیتی آنا۔''

☆☆

اُستاد (شاگرد سے): ''تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟''

شاگرد: ''جناب راستے میں اتنا کیچڑ تھا کہ ایک قدم آگے رکھتا تو دو قدم پیچھے چلا جاتا۔''

اُستاد: ''تو تم اسکول کیسے پہنچے؟''

شاگرد: ''میں نے اپنا منہ گھر کی طرف کر لیا تھا۔'' (احور کامران، لاہور)

پہلا دوست: ''تمہارے نوکر کا کیا نام ہے؟''

دوسرا دوست: ''بحرا لکاہل!''

پہلا دوست: ''بھلا یہ کیا نام ہوا؟''

دوسرا دوست: ''کیوں کہ وہ بہرہ ہے، اس لیے ہم اسے بحرالکاہل کہتے ہیں۔'' ☆☆

بچہ: ''کیا آپ کے پاس وہ پین ہے، جس کا ڈھکن سنہری اور نب باریک ہوتی ہے۔''

دُکان دار: ''ہاں! ہے......''

بچہ: ''اچھا! میرے پاس بھی ہے۔'' ☆☆

ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ ایک سہیلی سے ملنے گئی۔ چھوٹے بچے کو دیکھ کر سہیلی بولی: ''اس کی آنکھیں بالکل ماں جیسی ہیں۔''

ماں بولی: ''ماتھا باپ کا ہے۔''

بڑا بچہ فوراً بول اُٹھا: ''پاجامہ بڑے بھائی کا ہے۔'' (ندیم علی، گجرات)

لڑکی کے باپ نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا:

''نکل جاؤ یہاں سے، مجھے تو آج معلوم ہوا کہ تم گورکن ہو، حالاں کہ تم کہتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔''

''جناب! میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا بلکہ ہمیشہ یہی کہتا رہتا ہوں کہ میری روزی کا دارومدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔'' (کظیمہ زہرہ، لاہور)

ایک بچہ گوالے کے پاس دودھ لینے گیا تو گوالے نے پوچھا:

''آپ اپنا دودھ لینے آئے ہیں یا کسی اور کا؟''

بچے نے معصومیت سے جواب دیا: ''نہیں جناب! میں تو گائے کا دودھ لینے آیا ہوں۔'' (سویرا، لاہور)

☆☆☆

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (قدر دان، تھوڑے پر بہت دینے والا)

اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو بندے کے تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ اجر اور ثواب دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی نیکی کی بڑی قدر کرنے والے ہیں، تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ دیتے ہیں اور اس کی رحمت مغفرت کے بہانے تلاش کرتی ہے۔ اس لیے یہ دھیان رہے کہ ہم کسی بھی نیک عمل کو چھوٹا یا کم نہ سمجھیں۔ کیا معلوم کہ وہی نیکی ہماری مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ''اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہیں، اس لیے انہیں شکر بہت پسند ہے۔

شکریہ تو ادا کیجیے

جب کوئی ہم پر احسان کر دے مثلاً کسی نے راستہ بتا دیا، قلم نیچے گرا اور دوسرے نے اٹھا کر دے دیا تو ان کا بھی شکریہ ادا کریں۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ: ''جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔''

آپ دیکھیں کہ قرآن کریم سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا اور سورۂ فاتحہ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع ہوئی اور ہر نماز میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑھی جاتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تعریف اور شکر بہت پسند ہے۔

اس لیے جب ہم اسکول خیریت سے پہنچ جائیں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں، اسکول سے گھر خیریت سے آ جائیں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہیں، کھانا کھا لیا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں، پانی پی لیا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں، کھیل لیا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہیں، امتحان میں کامیاب ہو گئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہیں۔

جو جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا تو ''اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' تو قدر دان ہیں، اتنا اس کی نعمتوں میں اضافہ فرمائیں گے اور سب سے زیادہ شکریہ تو والدین کا ادا کرنا چاہیے۔ والدین کا شکریہ یہ ہے کہ ان کی فرماں برداری کی جائے، ان کا کہنا مانا جائے، ان سے اچھے سلوک سے پیش آیا جائے۔ والدین کا شکریہ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کا شکر ادا کرنا۔

دسترخوان اور شکریہ

عبدالشکور دوپہر کے وقت اسکول سے گھر آیا تو ہاتھ دھو کر فوراً کھانے کی طرف لپکا۔ آج اس کی پسند کا کھانا پکا تھا۔ گوشت اسے بہت پسند تھا۔

''امی! آپ نہیں کھائیں گی؟''

''بیٹا! مجھے حاشر کی دوا لینے کے لیے جانا ہے۔ اس لیے میں پہلے ہی کھا چکی ہوں، تم کھا لو۔''

عبدالشکور اکیلا ہی کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھا کر اس نے ایک لمحے میں دسترخوان اُٹھایا اور بچی ہوئی سب چیزیں کچرے دان میں پھینک دیں۔ کھانا کھا کر وہ بستر پر لیٹا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔

''تم نے ہماری ناقدری کر کے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی ہے۔''

روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے نے اس سے کہا۔

''اور ہمارے ساتھ بھی تمہارا سلوک بہت بُرا تھا۔'' یہ وہ ہڈیاں تھیں جو دسترخوان پر گوشت کھانے کے بعد بچ گئی تھیں۔

''اور ہمارے ساتھ کون سا شکر ادا کیا گیا ہے۔ عبدالشکور تمہارا نام تو بہت خوب صورت ہے، مگر تم نے ہمارے ساتھ اپنے نام کے برعکس معاملہ کیا ہے۔'' یہ کہنے والے دسترخوان کے وہ ریزے تھے جو روٹی میں سے بچ گئے تھے۔ عبدالشکور حیرت سے ٹکٹکی باندھے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''اور تمہارا کیا کرتا۔ کھانے کے بعد کچرے دان میں ہی تو ڈالنا تھا، کیا تمہیں بھی کھا جاتا؟'' اس نے جھلا کر کہا۔

''یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ تمہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ کھانے کا شکر کیا ہے؟'' بچی ہوئی ہڈیاں، روٹی کے چھوٹے ٹکڑے اور روٹی کے معمولی معمولی ریزے کہنے لگے۔ ''تم نے کیا احساس، احساس کی رٹ لگا رکھی ہے، جاؤ اپنا کام کرو۔'' اس نے غصے میں آ کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پشیمانی ہوئی کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔

''اچھا! چلیں معاف کر دیں۔'' یہ بتائیں کہ آپ کے ساتھ ناشکری کا معاملہ کس طرح ہو گیا؟'' دسترخوان کی بچی ہوئی چیزیں واپس جاتے جاتے رُک گئیں۔

''اس میں ہمارا تو کوئی فائدہ نہیں، البتہ تمہارا فائدہ ہے، اگر تم شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری نعمتوں میں اضافہ فرمائیں گے۔'' ان سب نے کہا۔

''عبدالشکور تمہارے دسترخوان پر چار قسم کی مخلوقات کھا سکتی تھیں۔''

''چار قسم کی مخلوقات!'' وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔

''اُف خدایا! آج میں کہاں پھنس گیا۔ میرے دسترخوان سے چار قسم کی مخلوقات کھا سکتی تھیں۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

''مگر کیسے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دیکھو! ایک مخلوق تو تم ہو کہ تم نے کھانا کھایا اور دوسری مخلوق کتے ہیں۔ اگر تم ہمیں کسی کتے کے سامنے ڈال دیتے تو وہ ہمیں کھا کر پیٹ بھر لیتا اور ہم کسی مخلوق کے پیٹ بھرنے کا سبب بن جاتے۔'' ہڈیوں نے وضاحت کی تو اسے بات سمجھ میں آنے لگی۔

''اوہ...... ہاں! میرا تو اس طرف کبھی خیال ہی نہیں گیا۔''

''تیسری مخلوق، بلیاں ہیں۔ اگر تم روٹی کے ٹکڑے گھر کی چھت پر ڈال دیتے تو ہمیں بلیاں اور کوے کھا جاتے۔ ہم بھی کسی کے کام آ جاتے اور ضائع نہ ہوتے۔'' یہ روٹی کے ٹکڑے تھے جنھوں نے اپنے استعمال ہونے کی وضاحت کی تھی۔

یہ سننا تھا کہ عبدالشکور نے حیرت سے اپنی انگلیاں دانتوں میں دبا لیں۔ ''میں کس قدر محروم رہا۔ کاش! میں ایسا کر لیتا۔''

''اور چوتھی وہ ننھی مخلوق ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا، یعنی ''چیونٹی'' جس کے نام کی پوری سورت قرآن کریم میں ہے۔ اگر تم روٹی کے چھوٹے چھوٹے ریزے اپنے گھر کے صحن کے کناروں پر ڈال دیتے، وہاں سے سینکڑوں چیونٹیاں روزانہ اِدھر اُدھر آتی جاتی ہیں، ہم بھی ان سینکڑوں چیونٹیوں کے پیٹ بھرنے کا ذریعہ بن جاتے۔'' روٹی کے چھوٹے چھوٹے ریزوں نے بھی وضاحت کی۔

''اُف! میں کس قدر ناشکرا اور بے پروا، بنا رہا۔''

''چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لو اور آئندہ کے لیے پکا ارادہ کر لو کہ دسترخوان کی بچی ہوئی چیزیں اس طرح اُٹھاؤ گے جس طرح ہم نے بتایا ہے۔''

''ہاں! میں ایسا ہی کروں گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

اچانک عبدالشکور زور سے بستر پر اُچھلا۔

''بیٹا! کیا ہوا ڈر گئے کیا؟'' امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے وہ سارا خواب امی کو سنایا تو امی نے بھی کہا کہ اس بات پر تو ہم نے بھی کبھی غور نہیں کیا۔ پھر امی کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کے لیے اُٹھ گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا احساس ایک خواب کے ذریعے کرا دیا تاکہ اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ کا شکر ادا ہو سکے اور یہ شکر مزید نعمتوں کے اضافے کا سبب بن سکے۔

ہمیشہ کے لیے شکر

ایک دعا آپؐ نے اپنے ایک صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کو سکھائی تھی اور فرمایا تھا: ''مجھے تم سے محبت ہے، لہٰذا تم ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا مت بھولنا۔

''اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِکَ''

ترجمہ: ''اے اللہ! تیرا ذکر کرنے میں، تیرا شکر کرنے میں اور اچھی طرح تیری عبادت کرنے میں میری مدد فرما۔''

☆☆☆

وقاص اسلم کمبوہ

پانچ روپے کا قرض

یہ برسوں پہلے کی بات ہے، رات کے اندھیرے میں چولہے کی آگ سے ہونے والی روشنی کے ارد گرد فریال اور فریحہ اپنے امی ابو کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ ایک پرانا سا کچا گھر جس میں ایک کمرہ اور چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ بجلی، گیس جیسی سہولیات سے محروم یہ آشیانہ شمس عرف شمو کی ملکیت تھا۔ شمو ایک غریب ڈاکیا تھا۔ انتہائی معقول آمدن کے باوجود وہ اپنے فرائض نہایت ذمہ داری سے ادا کرتا اور کبھی غفلت نہیں کرتا تھا۔ اس کے دو بچے فریال اور فریحہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ اپنے باپ کی طرح محنتی اور من میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔

شمو اپنی ڈیوٹی سے واپس آیا۔ اپنا تھیلا برآمدے میں لگی مخصوص ایک کھونٹی پر لٹکا دیا۔

''ابا جی! کل ہمارے اسکول میں ہیپاٹائٹس کے چیک اپ کے لیے فری میڈیکل کیمپ لگ رہا ہے...... ہر بچے کو گھر سے پانچ روپے لانے کو کہا ہے۔'' فریال کھانا کھاتے ہوئے اپنے ابو جان سے مخاطب ہوا۔

شمو بغیر کوئی جواب دیئے کھانے میں مگن رہا۔ اس دور میں پانچ روپے بڑے معنی رکھتے تھے، اس لئے شمو نے اپنے بیٹے کے دو بار پیسے مانگنے پر بھی سر ہلا کر ٹال دیا۔

دوسرے دن سب بچے باری باری اپنا خون ٹیسٹ کروا رہے تھے، فریال اپنی باری آنے پر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کیوں کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ جب حیدر کو حقیقت کا پتا چلا تو اس نے چپکے سے پانچ روپے فریال کی جیب میں ڈال دیئے اور زبردستی اسے خون ٹیسٹ کروانے بھیج دیا۔ فریال کو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ ادھار نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ اسے پتا تھا یہ قرض ہے اور یہ کہیں قرض ادا کرنا میرے لیے مشکل ہو سکتا ہے۔

☆

وقت گزرتا گیا، فریال ڈاکٹر بن گیا۔ کان میں معمولی درد ہونے کی وجہ سے حیدر عشاء کے بعد ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اس علاقے میں نیا کرائے دار تھا، اس لئے اس علاقے کی ہر جگہ اس کے لئے نئی تھی۔ کل اس کے پڑوسی نے ایک ڈاکٹر کا پتا بتایا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو ان کے پاس چلے جانا، وہ بڑی سڑک کے کنارے اسپتال میں بیٹھتے ہیں۔ خیر وہ وہاں پہنچ گیا۔ مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ خدا خدا کر کے دو گھنٹے کے کمر توڑ انتظار کے بعد اس کا نمبر بھی آ گیا۔

نسخہ تجویز کرتے وقت جب اس نے اپنا نام ''حیدر'' بتایا تو ڈاکٹر صاحب کا قلم رُک گیا کیوں کہ وہ ہمیشہ حیدر نامی مریض کا اچھی

طرح تعارف لیتا تھا۔ آج اسے وہ حیدر مل گیا تھا جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی، کیوں کہ وہ ''حیدر کمال'' کا مقروض تھا۔ جب ڈاکٹر فریال شمس نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔ رسمی دعا سلام اور تعارف کے بعد وہ چائے پینے چلے گئے۔ ڈاکٹر فریال بولے۔ ''مجھے آپ کا برسوں سے انتظار تھا۔ میں نے آپ کا قرض دینا تھا۔''

''کیسا قرض......؟'' حیدر حیران ہوا۔

''پانچ روپے کا قرض۔'' ڈاکٹر فریال نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں......'' حیدر نے تجسس سے کہا۔

''ہم چھٹی کلاس میں تھے، اس وقت آپ نے ہیپاٹائٹس کے ٹیسٹ کے لئے مجھے پانچ روپے دیے تھے، جو مجھ پر تمہارا قرض تھا اور اس کی واپسی مجھ پر فرض تھی۔'' ڈاکٹر فریال نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ارے ڈاکٹر فریال یہ کون سی اتنی بڑی رقم تھی، جس کے لیے آپ نے اتنا لمبا عرصہ میرا انتظار کیا۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں حیدر! قرض تو قرض ہوتا ہے نا، کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو لوگوں کا مال قرض کے طور پر ادا کرنے کی نیت سے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف سے ادا کرے گا اور جو کوئی تباہ کرنے کی نیت سے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو تباہ کرے گا۔''

(صحیح بخاری والیم نمبر3، حدیث نمبر2387)

اگرچہ آپ نے مجھے وہ پانچ روپے زبردستی دیئے تھے، لیکن وہ مجھ پر قرض تھا اور یہ قرض میں نے ادا کرنے کی نیت سے رکھا تھا نہ کہ آپ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے۔'' ڈاکٹر فریال سنجیدگی سے کہتے چلے گئے۔ حیدر ان کی باتوں کو توجہ سے سن رہا تھا، وہ مزید بولے۔ ''اس وقت کئی بار کوشش کے باوجود میں آپ کا قرض نہ لوٹا سکا۔ مجھے گھر سے ہر ماہ صرف دس روپے ملتے تھے جس میں سے آٹھ روپے اسکول کی فیس ادا کر دیتا تھا۔ ہر ماہ ایک روپیہ خرچ کر کے باقی روپے بچاتا تھا، لیکن پانچ ماہ بعد پانچ روپے ہوئے تو میرے قلم کی نب ٹوٹ گئی۔ اس طرح پانچ روپے خرچ ہو گئے۔ کئی بار کوشش کے باوجود میں آپ کے پیسے نہ لوٹا سکا۔

اسی کسم پرسی کے حالات میں ہماری میٹرک مکمل ہو گئی، لیکن میرے پاس آپ کو دینے کے لیے پانچ کا سکہ نہ بن سکا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں نے پڑھائی جاری رکھی اور شام کے اوقات میں ایک فیکٹری میں مزدوری کر کے اپنے اخراجات پورے کیے۔ والدین کی دعاؤں سے آج اللہ تعالیٰ نے اتنی عزت دی ہے۔''

ان الفاظ کی ادائیگی کے وقت غم اور خوشی کے ملے جلے آنسو ڈاکٹر فریال کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس نے پانچ کا سکہ نکالا اور حیدر کو تھمانا چاہا، لیکن حیدر نے روتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا اور فریال کی ایمان داری اور فرض شناسی کی داد دیتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا۔ ڈاکٹر فریال کی ایمان داری نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ حیدر نے دل میں عہد کیا کہ وہ ہر ایک کا قرض ضرور لوٹائے گا، جن لوگوں سے وہ قرض لے چکا تھا۔

......☆......

بقیہ: سرخ اونی چادر

چادر بہت خوش تھی کیوں کہ وہ کسی کی مدد کر رہی تھی اور ڈراؤنے کی کپکپاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ ڈراؤنے نے چادر سے پوچھا۔ ''مجھے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' چادر اسے اپنے زندگی کے تجربات کے بارے میں بتانے لگی اور ڈراؤنا انہماک سے سنتا رہا۔ چادر نے پھر ڈراؤنے کو بتایا۔ ''میں آج زندگی کے کسی لمحے سے بھی زیادہ خوش ہوں کیوں کہ میں تمہارا خیال کر سکتی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ تم بھی میرا خیال رکھو گے۔'' ڈراؤنے نے اسے بتایا کہ وہ دُنیا کی سب سے اچھی چادر ہے۔ اس فقرے کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ڈراؤنے نے یہ الفاظ پوری سچائی سے ادا کئے تھے۔

بچو! ایک چادر کی داستان آپ نے پڑھی جس کی سب سے بڑی خواہش لوگوں کو آرام پہنچانا تھا۔ آپ کو نہیں لگتا ہمارے بزرگ بھی ہمارے لیے ایک چادر ہی ہیں جو ہمیں چادر کی طرح ہی ڈھانپے رکھتے ہیں۔ جب تک وہ بوڑھے نہیں ہو جاتے تو کیوں نہ تہیہ کریں کہ بڑے ہو کر ہم ان کی چادر بنیں گے اور انہیں بھی محبت کے بدلے میں بے تحاشا عزت و احترام دیں گے۔

☆☆☆

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

☆ صبر کام یابی کی کنجی ہے، یعنی کام یابی کا یقینی ذریعہ۔
☆ ہمیشہ سچ بولو اور سچی گواہی دو۔
☆ کسی کا حق مارنا گناہ کبیرہ ہے، یعنی بہت بڑا گناہ۔
☆ شرک نہ کرو یہ ناقابلِ معافی گناہ اور ظلم ہے۔
☆ علم سیکھنا اور سکھانا بہت بڑی نیکی ہے۔
☆ کسی کو گالی نہ دو۔ اللہ تعالیٰ گندی باتوں اور گندے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔
☆ جھوٹ بولنا چھوڑ دو گے تو بُری عادتیں بھی چھوٹ جائیں گی۔
☆ اللہ تعالیٰ کے بندوں سے محبت کرو، وہ تم سے محبت کرے گا۔
☆ حق یا سچ کو نہ چھپاؤ کہ یہ گناہ ہے۔
☆ مظلوموں کی مدد کرنا فرض ہے۔

قائداعظمؒ کا پہلا یومِ پیدائش

25 دسمبر 1940ء کو قائداعظمؒ کی سال گرہ عوامی سطح پر منائی گئی اور یہ قائداعظمؒ کا 65 واں یومِ پیدائش اور 64 ویں سال گرہ تھی۔ اس موقع پر مدراس کے ایک اخبار نویس محمود حسن نے 84 صفحات کا سووینیئر نکالا اور 25 دسمبر 1940ء کو قائداعظمؒ کو پیش بھی کیا۔ یہ سووینیئر ایک دستاویز ہے، جس میں متحدہ ہندوستان کی اکتیس سیاسی اور ممتاز شخصیات کے قائداعظمؒ کی سال گرہ پر پیغامات ہیں۔ ان میں تئیس نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں یہ پیغامات بھیجے، ان میں بعض غیر مسلم شخصیات بھی تھیں۔

......☆......

25 دسمبر 1945ء کو قائداعظمؒ کی سال گرہ بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔ بمبئی کے ہر مسلمان علاقے میں محرابیں بنائی گئیں اور خوشی کے مظاہرے ہوئے۔ یہ خوشی لوگ اپنی طرف سے منا رہے تھے، انہیں پابند نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمان علاقے دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔

(احور کامران، لاہور)

قائداعظمؒ اور مزاح

1941ء کی سال گرہ کے روز قائداعظمؒ ناگ پور میں تھے۔ یہاں آپ نے سی پی و ہرار مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کیا، فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل عبدالستار صدیقی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا۔

''آپ کا شہر ناگ پور مجھے بہت پسند آیا ہے۔ خاموش اور پُرسکون جگہ ہے فاطمہ اور میں نے عیدالاضحیٰ یہیں آپ کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

قائداعظمؒ کی طبیعت میں مزاح تو بہت تھا۔ اُنتیس کو عید تھی۔ قائداعظمؒ کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد پچاس، ساٹھ ہزار ہوگئی۔ ہر کوئی قائداعظمؒ سے ہاتھ ملانے کے لیے بے قرار تھا۔ قائداعظمؒ کا اصول رہا کہ اگر ہاتھ ملایا تو سب کے ساتھ ورنہ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سب کو مشترکہ سلام کر دیا۔ لوگوں میں بے چینی دیکھ کر وہ مائیک پر آئے اور اُردو میں کہا: ''آپ کو عید مبارک۔'' لوگوں نے یک زبان جواب دیا۔ ''آپ کو بھی عید مبارک۔'' قائداعظمؒ نے کہا۔ ''اگر آپ سب لوگ مجھ سے ہاتھ ملائیں گے تو میرا ہاتھ یہیں رہ جائے گا۔'' لوگ ہنس پڑے۔ قائداعظمؒ نے السلام علیکم کہا اور پاکستان زندہ باد۔ قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں میں روانہ ہو گئے۔ یوں 1941ء کی سال گرہ ناگ پور میں منانے کے ساتھ بڑی عید بھی قائداعظمؒ نے وہیں منائی۔

(سویرا کامران، لاہور)

علم

☆ علم ایسا بادل ہے جس سے رحمت ہی رحمت برستی ہے۔
☆ علم ایسی کنجی ہے جس سے کام یابی کے تمام دروازے کھلتے ہیں۔
☆ علم ایسا درخت ہے جس کا پھل نہ کبھی خشک اور نہ سکڑتا ہے۔
☆ علم مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں سے اس کو ملے حاصل کرلے۔
☆ وہ علم بے کار ہے جو انسان کو کام کرنا تو سکھا دے مگر زندگی گزارنے کا سلیقہ نہ سکھائے۔
☆ علم ایسا پودا ہے جسے دل و دماغ کی سرزمین میں لگانے سے عقل کے پھل لگتے ہیں۔
☆ جو شخص تعلیم حاصل کرنے کی مصیبت نہیں جھیلتا، اسے ہمیشہ

جہالت کی ذلت جھیلنی پڑتی ہے۔ (جواد اعجاز، صوابی)

دریچے

ایک دفعہ مشہور فرانسیسی بادشاہ نپولین، پولینڈ میں جنگی محاذ پر مصروف تھا کہ اس کے پاس کچھ روسی قیدی لائے گئے۔ ان کا رویہ نپولین کے خلاف تلخ تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”ہم روسی تم سے کئی گنا بہتر ہیں، کیوں کہ ہم وقار کے لیے لڑتے ہیں اور تم دولت کے لیے۔“

یہ سن کر نپولین نے جواب دیا۔ ”ہر شخص اس شے کے لیے لڑتا ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔“ (فائزہ رزاق، خانیوال)

کام یابی کے پانچ اصول

☆ ہمیشہ یقین رکھیں کہ آپ جیت سکتے ہیں۔
☆ کام یابی کا انحصار کوشش، محنت اور منصوبہ بندی پر ہے۔
☆ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ میں تبدیلیاں لائیں۔
☆ اپنی منزل کا تعین کیجیے۔
☆ مشکلوں، پریشانیوں اور تکالیف کا مقابلہ بہادری سے کیجیے۔

(ابرار الحق، راجہ جنگ)

دوست

لفظ دوست زبان سے ادا کرنا کس قدر سہل ہے مگر اس کے مفہوم کو سمجھنا ہر کسی کے لیے آسان نہیں۔ دراصل یہ چار حروف کا مجموعہ ہے۔ ”د“ سے دیانت داری۔ ”و“ سے وفاداری۔ ”س“ سے سچائی اور ”ت“ سے تابع داری مراد ہے۔ اگر ان چار حروف کا وجود دو دوستوں کے درمیان قائم رہتا ہے تو دوستی کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ دوستی ایک ہمہ گیر رشتہ ہے جسے بہت کم لوگ سمجھ پاتے ہیں۔ وہ باتیں، وہ مسائل جو ہم ماں باپ یا بہن بھائیوں سے شیئر نہیں کر سکتے، ان کا حل اپنے مخلص دوست سے پوچھ سکتے ہیں۔ وہ تمام خوبیاں جو ہم مختلف رشتوں میں علیحدہ علیحدہ ڈھونڈتے ہیں، اگر ایک ہی رشتے میں یکجا کرنا چاہیں تو ہم ایک دوست میں یہ خوبیاں پا سکتے ہیں۔ ماں باپ اور اولاد کے بعد سب سے عظیم اور محبت بھرا رشتہ دوستی ہے۔ (ندا افتخار، چشتیاں)

اقوالِ زریں

☆ زندگی کی درازی کا راز صبر میں پوشیدہ ہے۔
☆ نصیحت خواہ دیوار پہ لکھی ہو، اس کو اپنے کانوں میں ڈال لو۔
☆ دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے بچو۔
☆ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینا بھی نیکی ہے۔
☆ جس نے اپنی زندگی کو قبول کیا، اس نے خدا کو مان لیا۔
☆ ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔
☆ انسان، زبان کے پردے میں چھپا ہے۔

(عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ لاہور)

جنازہ کے ساتھ چلنے اور نمازِ جنازہ پڑھنے کا ثواب

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو آدمی ایمان کی صفت کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ جائے اور اس وقت تک جنازہ کے ساتھ رہے جب تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اور اس کے دفن سے فراغت ہو تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر واپس ہوگا جن میں سے ہر قیراط گویا اُحد پہاڑ کے برابر ہوگا اور جو آدمی صرف نمازِ جنازہ پڑھ کر واپس آ جائے اور دفن ہونے تک ساتھ نہ دے تو وہ ثواب کا ایسا ہی ایک قیراط لے کر واپس ہوگا۔

☆

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جنازہ کو تیز لے جایا کرو۔ اگر نیک ہے تو قبر اس کے لیے خیر ہے یعنی اچھی منزل ہے جہاں تم تیز چل کے اسے جلد پہنچا دو گے اور اگر اس کے سوا دوسری صورت ہے یعنی جنازہ نیک کا نہیں تو ایک بُرا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔ تم تیز چل کر جلدی اس کو اپنے کندھوں سے اُتار دو گے۔“ (صحیح بخاری و مسلم، معارف الحدیث)

(صائمہ تحریم، کوئٹہ)

سکون کی تلاش

سکون کے دروازے پر بھکاری کی طرح کبھی نہ جانا، بادشاہ کی طرح جانا۔ جھومتے جھامتے، دیتے بکھیرتے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بھکاریوں پر ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے اور بھکاری کون ہوتا ہے؟ وہ جو مانگے، جو صدا دے، جو تقاضا کرے اور شہنشاہ کون ہوتا ہے؟ جو عطا کرے، لٹاتا جائے۔ پس جس راہ سے بھی گزرو بادشاہوں کی طرح گزرو، شہنشاہوں کی طرح گزرو...... دیتے جاؤ دیتے جاؤ۔ غرض و غایت کے بغیر، شرائط کے بغیر۔ ☆☆☆

میری زندگی کے مقاصد

منیبہ شہباز، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

عبداللہ طارق، تاندلیانوالہ
میں بڑا ہو کر حافظِ قرآن بنوں گا اور دُنیا میں دینِ اسلام پھیلاؤں گا۔

ولید احمد محمد اسماعیل، گوجرانوالہ
میں آرمی میں شامل ہو کر ملک وقوم کی حفاظت کروں گا۔

محمد عمر بلوچ، لاہور
میں بڑا ہو کر عالم بنوں گا اور دین کی روشنی پوری دُنیا میں پھیلاؤں گا۔

محمد دانیال، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد طہٰ شفیق، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

ام ہانی بلوچ، لاہور
میں بڑی ہو کر عالمہ بنوں گی اور دینِ اسلام کی خدمت کروں گی۔

انوشہ خالد، راول پنڈی
میں آرمی آفیسر بننا چاہتی ہوں۔

اذان حسن، ٹیکسلا
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

سبطین بابر، وچھیاں والہ
میں بڑا ہو کر ایئر فورس میں جاؤں گا اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

جویریہ خالد، اسلام آباد
میں ڈاکٹر بن کر آرمی جوائن کروں گی۔

عتیق الرحمان، کوٹ مبارک
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

فاطمہ طارق، راول پنڈی
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور ملک کی خدمت کروں گی۔

علیان، کراچی
میں بڑا ہو کر پاک فوج میں شامل ہوں گا اور ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

انیسہ بانو، کوٹ مبارک
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور انسانیت کی خدمت کروں گی۔

محمد عمر فاروق، سیال کوٹ
میں بڑا ہو کر سائنس دان بنوں گا اور پاکستان کی ترقی میں حصہ ڈالوں گا۔

محمد نعمان شریف، اوکاڑہ
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور عالمِ دین بنوں گا۔

عفراء رحمان، لاہور
میں بڑی ہو کر اُستانی بنوں گی اور قوم کے بچوں کو تعلیم کی روشنی دوں گی۔

محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
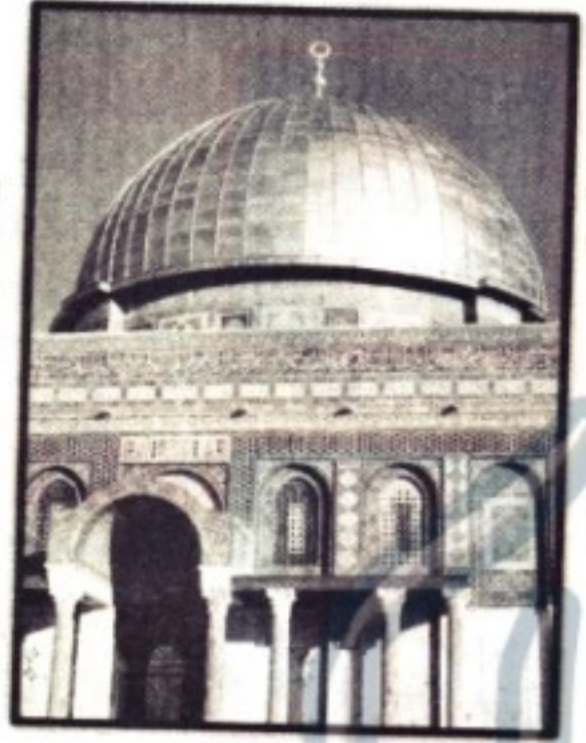
جب حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوا تو آپ کے فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام جوان تھے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو نبوت اور حکومت عطا کر کے باپ کا جانشین بنایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بھی بہت سے معجزے عطا کر رکھے تھے۔ آپؑ جانوروں کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔ ہوا پر آپؑ کا قابو تھا۔ آپؑ کا تخت ہوا میں اُڑا کرتا تھا۔ جن بھی آپؑ کے تابع تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر شروع کی تو جن دُور دُور سے پتھر اور سمندر سے موتی نکال نکال کر لایا کرتے تھے۔ آپؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی، اس انگوٹھی کی بدولت آپؑ جن و انس پر حکومت کیا کرتے تھے لیکن وہ انگوٹھی کسی وجہ سے گم ہوگئی اور شیطان کے ہاتھ آگئی۔ چناں چہ آپؑ تخت و سلطنت سے محروم ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد وہ انگوٹھی شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر پڑی جسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ نے پکڑ لی۔ جب اس کو چیرا گیا تو انگوٹھی اس کے پیٹ سے مل گئی اور اسی طرح آپؑ کو دوبارہ سلطنت اور حکومت مل گئی۔ ایک دفعہ حضرت سلیمانؑ اپنی کثیر التعداد فوج کے ساتھ ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں چیونٹیاں بکثرت تھیں۔ اس عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر چیونٹیوں کے سردار نے کہا۔ ''چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کی فوج تم کو ہلاک کر دے۔'' چیونٹی کی یہ بات سن کر حضرت سلیمانؑ ہنس پڑے اور فرمانے لگے۔ ''اے اللہ! مجھ کو توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں، جو کچھ تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھ کو پسند ہوں اور اپنی رحمت سے تو مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔'' حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک دن حضرت سلیمانؑ کا دربار لگا ہوا تھا۔ دیکھا کہ ہدہد غیر حاضر ہے۔ کچھ دیر بعد ہدہد بھی حاضر ہوگیا۔ حضرت سلیمانؑ کے دریافت کرنے پر ہدہد نے بتایا کہ میں اڑتا ہوا یمن کے ملک میں جا پہنچا تھا جہاں کی حکومت ملکہ سبا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے لیکن شیطان نے اس کو گمراہ کر رکھا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ تو میرا خط اس کے پاس لے جا۔ چناں چہ ہدہد آپؑ کا خط لے کر ملکہ سبا کے پاس پہنچا۔ ملکہ سبا نے بہت سے تحفے تحائف حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بھیجے۔ آپؑ نے ان تحائف کو دیکھ کر فرمایا کہ ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد نہیں سمجھا۔ آپؑ نے ملکہ کے سفیروں کو دیکھ کر فرمایا۔ ''یہ تحفے واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر میرے پیغام کی تعمیل نہ کی تو میں عظیم الشان لشکر لے کر وہاں پہنچوں گا اور تم کو رسوا اور ذلیل کر کے تمہارے شہر سے نکال دوں گا۔'' ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ کے پیغمبرانہ جاہ و جلال کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ سے نکاح کر لیا اور اپنے ملک میں واپس آگئی اور حضرت سلیمانؑ اسے ملنے کے لیے اکثر اس کے ملک میں جایا کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جنوں کی ایک جماعت بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مصروف تھی کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کا وقت آن پہنچا۔ آپ ایک لاٹھی کے سہارے کھڑے ہو گئے اور انتقال فرما گئے۔ جنوں کو آپ کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ آخر ایک عرصہ کے بعد جب ان کی لاٹھی کو دیمک نے چاٹ لیا تو وہ بودی ہو کر گر پڑی اور حضرت سلیمانؑ جو لاٹھی کے سہارے کھڑے تھے وہ بھی گر پڑے۔ اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ تو مدت سے انتقال کر چکے ہیں۔ افسوس ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ کاش ہم علم غیب سے واقف ہوتے اور عرصہ تک حضرت سلیمانؑ کے خوف سے اس کام میں نہ لگے رہتے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/دسمبر 2016ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/دسمبر 2016ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

دسمبر کا موضوع ''پاک فوج'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/دسمبر 2016ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

ب	س	ء	ش	ک	ن	ا	چ	ا	ڑ
ژ	ل	ض	پ	ط	خ	ی	ث	ن	ش
گ	ط	خ	ل	ا	ف	ت	ذ	ج	و
ہ	ن	ی	ف	ڑ	ی	ل	س	ن	م
ت	ت	چ	ث	ا	ر	ی	م	گ	ا
ش	ء	ز	ص	ہ	غ	س	ر	ل	خ
ز	م	ح	س	و	س	ژ	ا	ی	ض
گ	ع	ڈ	ٹ	خ	ظ	ٹ	ن	ک	ے
ر	پ	ہ	ع	م	و	م	غ	م	چ
س	چ	ق	ت	ک	ل	ی	ف	ظ	د

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

خلافت سرگزشت مغموم خاموش محسوس سلطنت میراث اچانک جنگلی تکلیف
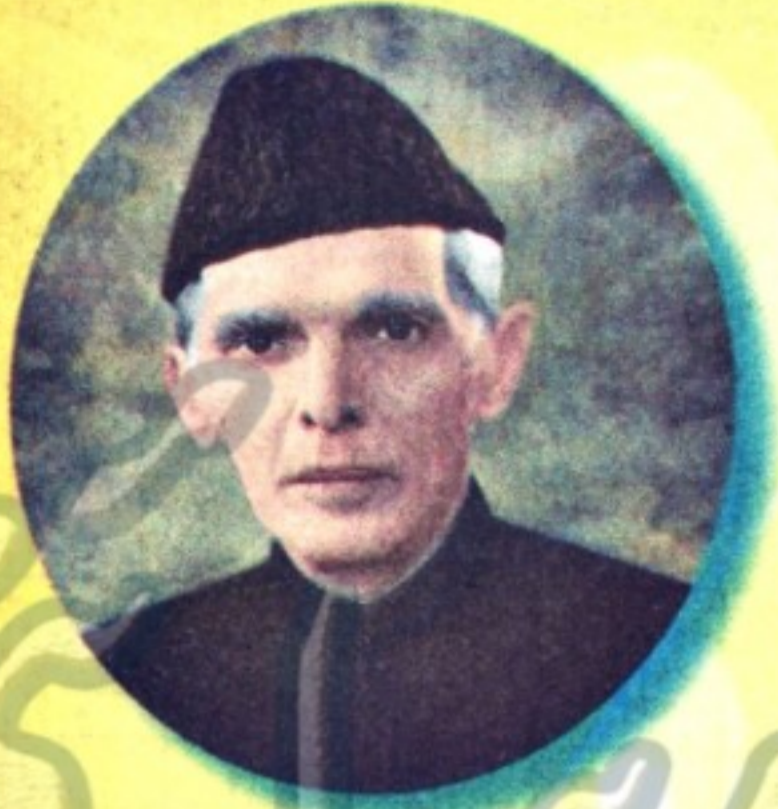
مِلّت کا پاسباں محمد علی جناحؒ

میاں محمد بشیر

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ
ملت ہے جسم ، جاں ہے محمد علی جناحؒ

صد شکر پھر ہے گرمِ سفر اپنا کارواں
اور میرِ کارواں ہے ، محمد علی جناحؒ

بیدار مغز ، ناظم اسلامیانِ ہند
ہے کون ؟ بے گماں ہے ، محمد علی جناحؒ

تصویرِ عزم ، جانِ وفا ، روحِ حُریت
ہے کون ؟ بے گماں ہے ، محمد علی جناحؒ

رکھتا ہے دل میں تاب و تواں نو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے ، محمد علی جناحؒ

رگ رگ میں اِس کی ولولہ ہے حُبِ قوم کا
پیری میں بھی جواں ہے ، محمد علی جناحؒ

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے ، محمد علی جناحؒ

ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے ، محمد علی جناحؒ

غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے ، محمد علی جناحؒ

اے قوم ! اپنے قائداعظمؒ کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے ، محمد علی جناحؒ

عمرِ دراز پائے ، مسلماں کی ہے دُعا
ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناحؒ

☆ تحریک پاکستان کے ممتاز راہنما میاں بشیر احمد نے اپنی لکھی ہوئی یہ نظم آل انڈیا مسلم لیگ کے 27ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں بتاریخ 22 مارچ 1940ء کو قائداعظم کی موجودگی میں پڑھی۔

ریزال پارک

ریزال پارک (Rizal Park) فلپائن کے شہر منیلا (Manila) کا تاریخی مقام ہے۔ یہ براعظم ایشیا کے بڑے پارکوں

میں سے ایک ہے۔ منیلا شہر کی یہ اہم تفریح گاہ بھی ہے۔ لگ بھگ 140 ایکڑ پر پھیلے اس پارک کا افتتاح 1820ء میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ علاقہ ہسپانوی قبضے میں تھا۔ بنیادی طور پر یہ دلدلی علاقہ تھا۔ بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کے لیے یہاں بلند دیوار بھی بنائی گئی تھی۔ ہسپانوی (Spanish) فوج نے یہاں اسپتال بھی تعمیر کروایا تھا جو زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا۔ 1874ء سے 1885ء کے عرصے میں اس پارک میں مجرموں اور آزادی کا سوال کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ اسپین کے بادشاہ نے ذاتی دل چسپی سے مستطیل نما 330 فٹ لمبا اور 980 فٹ چوڑا پارک بنوایا۔ اس پارک کی وجہ شہرت فلپائن کے محب وطن رہنما، شاعر و ادیب "Jose Rizal" کی یادگار ہے جو جست (زنک) اور گرے نائٹ (Granite) سے بنی ہے۔ ہر سال ہزاروں سیاح یہاں آتے ہیں۔ 30 دسمبر 1913ء کی ریزال کی 17 ویں برسی کے موقع پر پارک میں یادگار کا افتتاح کیا گیا۔ 1955ء میں اس پارک کا رقبہ 16.24 ہیکٹر (Hectors) تھا۔ پارک میں خوب صورت فوارے بھی نصب ہیں۔ پارک کے مرکزی حصے میں قائم ان فواروں کے تالاب کی لمبائی 130 فٹ اور چوڑائی 330 فٹ ہے۔ ریزال پارک میں بڑی بڑی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

گاشر برم-I

اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے دنیا بھر میں 11 دسمبر کو ہر سال پہاڑوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے تا کہ لوگ ان قدرتی نعمتوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ گاشر برم-I (Gasherbrum-I) پاکستان کی تیسری اور دُنیا کی 11 ویں بلند ترین چوٹی ہے۔ گاشر برم اوّل کو
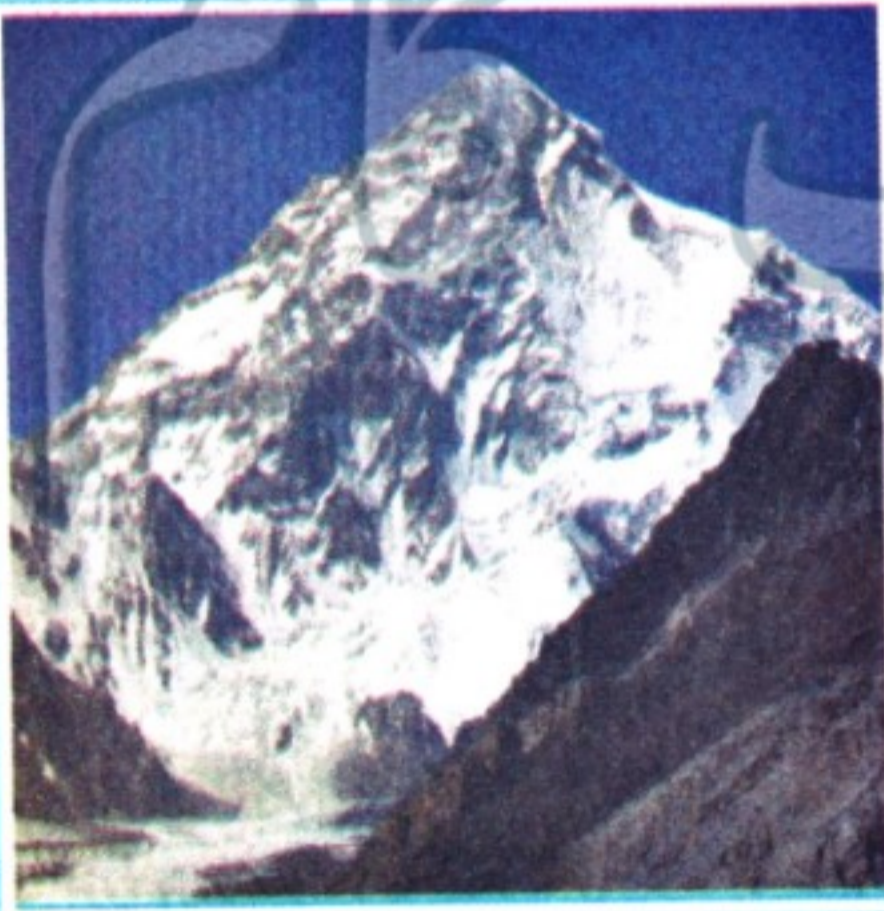
چھپی چوٹی (Hidden Peak) بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان کے شمال میں سلسلہ کوہ قراقرم میں واقع اس بلند ترین چوٹی کی بلندی 26509 فٹ (8080 میٹر) ہے۔ اس چوٹی کو سب سے پہلے جرمنی نژاد کوہ پیما جی او ڈیرن فورتھ (Gunter Oskar Dyhrenfurth) نے تلاش کیا۔ یہ کوہ پیما 12 نومبر 1886ء کو جرمنی میں پیدا ہوا تھا جب کہ 14 اپریل 1975ء کو آپ کا انتقال

ہوا۔ آپ نے دو پہاڑی چوٹیوں کو گاشر برم اوّل اور گاشر برم دوم کا نام دیا۔ یہ چوٹی پہلی مرتبہ 1958ء کو سر کی گئی۔ اس کے بعد گاشر برم سوم اور گاشر برم چہارم کے نام سے بھی پہاڑی چوٹیاں معلوم ہو چکی ہیں۔ سال 2003ء سے یہ دن منایا جا رہا ہے۔ جاپان میں ہر سال 11 اگست کو پہاڑوں کا قومی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن ملک میں سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔

شورے کا تیزاب

شورے کے تیزاب کو نائٹرک ایسڈ (Nitric Acid) یا ایکوا فورٹس "Aqua Fortis" بھی کہا جاتا ہے۔ سلفیورک ایسڈ کے بعد یہ طاقت ور ترین تیزاب ہے۔ اس کی تیاری میں پوٹاشیم نائٹریٹ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا فارمولہ "HNO_3" ہے۔ یہ بے رنگ، پیلا یا سرخی مائل ہوتا ہے جس کی چبھتی ہوئی بو ہوتی ہے۔ اس کی
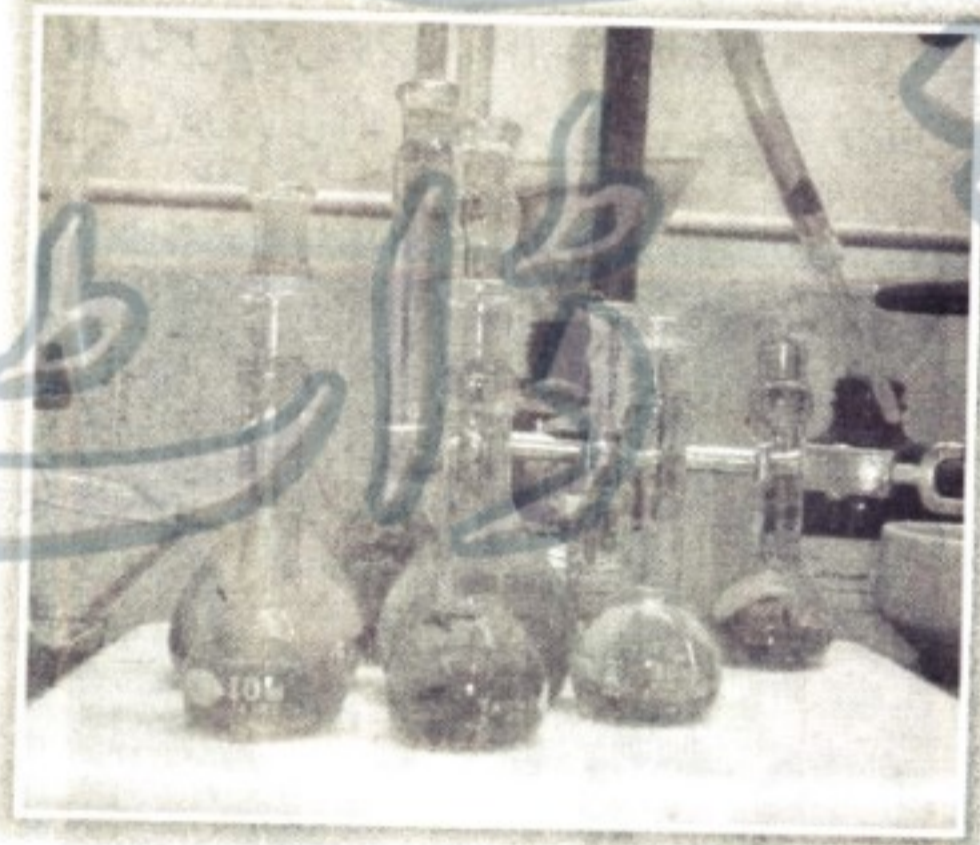
کثافت (Density) $1.5129gcm^3$ ہوتی ہے۔ یہ تیزاب براؤن بوتل میں رکھا جاتا ہے کیوں کہ روشنی اور گرمی سے یہ تیزاب خراب ہو جاتا ہے۔ بوتل کا ڈھکن کھولنے پر سفیدی مائل بخارات نکلتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ تیزاب دھاتوں مثلاً میگنیشیم، کاپر، سلور وغیرہ کے ساتھ عمل کر کے ہائیڈروجن خارج کرتا ہے۔ خالص سونا اور پلاٹینم جیسی قیمتی دھاتیں اس تیزاب سے عمل (Reaction) نہیں کرتیں۔ انسانی یا حیوانی جلد (skin) کو یہ تیزاب جلا (Burn) دیتا ہے۔ نائٹروجن آکسائیڈ (NO_2) پانی کے ساتھ عمل کر کے نائٹرک ایسڈ بناتی ہے۔ یہ تیزاب راکٹ کے ایندھن کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ صفائی کرنے والے کیمیکلز میں بھی یہ تیزاب استعمال ہوتا ہے۔ اس تیزاب کی تیاری کا سہرا مسلمان سائنس دان جابر بن حیان کے سر ہے۔ اس تیزاب کو ایکوا فورٹس کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے "Strong Water" یعنی مضبوط پانی!

انجیل

ہر سال 25 دسمبر کو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا دن بنام کرسمس ڈے (Christmas Day) منایا جاتا ہے۔ آپؑ اللہ پاک کے برگزیدہ نبی ہیں۔ مولا کریم نے انجیل (Gospel) نامی مقدس الہامی کتاب کے ذریعے آپ کو لوگوں کی ہدایت کا پیامبر بنایا۔ آپ حضرت مریمؑ کے صاحب زادے ہیں۔ حضرت آدمؑ کے بعد

آپؑ واحد نبی اور انسان ہیں جو بغیر والد کے پیدا ہوئے۔ آپؑ نے لوگوں کو اللہ کا حکم پہنچایا اور انجیل مقدس سے ہدایت لینے کا حکم دیا۔ انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت، حیات اور واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ انجیل کو "Gospel" پکارا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''اچھی خبر'' جب کہ یونانی لوگ اس کا مطلب ''عمدہ پیغام'' لیتے ہیں۔ بلاشبہ پروردگار عالم نے اس کتاب میں شریعت کے لحاظ سے رہنمائی کے ارشادات ارسال کیے ہیں لیکن بدقسمتی سے لوگوں نے اس مقدس الہامی کتاب میں تحریف وتبدیلی کر ڈالی ہے۔ اس لیے اس کی اصلیت برقرار نہیں رہی۔ اس کتاب کو بیان کرنے والوں میں متی (Mathew)، مرقس (Marks)، لوقا (Luke) اور یوحنا (John) شامل ہیں۔

☆☆☆

پیارے بچو! آپ نے خرگوش اور کچھوے کی کہانی تو پڑھی ہے، آیئے! آج آپ کو خرگوش کے بارے میں معلومات دیں۔ خرگوش ممالیہ جانور ہیں جو کہ اپنے پیدا ہونے والے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ خرگوش کی 45 سے زائد نسلیں کرہ ارض پر پائی جاتی ہیں۔

خرگوش سبزی خور جانور ہے۔ گاجریں ان کی پسندیدہ خوراک ہیں۔ یہ سبزیاں، درختوں کی چھال اور جھاڑیاں وغیرہ کھانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ خرگوش کی خوراک اس کی اچھی صحت کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ غلط خوراک خرگوش کی جان بھی لے سکتی ہے۔ 4 پونڈ وزنی خرگوش 20 پونڈ وزنی کتے جتنا پانی پی سکتا ہے۔

خرگوش کو اگر سماجی جانور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ یہ گروہ میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور گروہ میں ان کی شرارتیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

ان کے کان لمبے اور انتہائی حساس ہوتے ہیں۔ ان کے کان جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھتے ہیں۔ خرگوش کے کان خطرے کا احساس دلانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

خرگوش کی آنکھیں بڑی اور نہایت خوب صورت ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر قدرت کی کاری گری پر رشک آتا ہے۔ یہ اپنا سر ہلائے بغیر پیچھے کی جانب دیکھ سکتا ہے۔ ان کے دانتوں کی تعداد 28 ہوتی ہے۔ اسے کترنے والا جانور بھی کہتے ہیں۔

خرگوش کو چست اور چالاک جانور بھی کہا جاتا ہے۔ جب یہ خوش ہوتا ہے تو اِدھر اُدھر چھلانگیں لگاتا اور پھدکتا پھرتا ہے۔ یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

خرگوش کے لیے ایک دن میں کم از کم چار گھنٹے کی ورزش ضروری ہوتی ہے۔ یہ 36 انچ لمبی چھلانگ لگا سکتا ہے۔ اپنی افزائش نسل کے اعتبار سے بھی یہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایک سال میں 20 سے 40 بچے پیدا کر سکتا ہے۔

خرگوش کو بھیڑیوں، بلیوں اور لومڑیوں جیسے جانوروں سے خطرہ ہوتا ہے، اس لیے یہ ان جانوروں سے دُور رہنا پسند کرتا ہے۔

خرگوش اپنی پچھلی ٹانگوں پر سیدھا کھڑے ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت کی بناء پر وہ خطرے کو دُور ہی سے بھانپ لیتا ہے۔ خاموش طبع یہ جانور مختلف قسم کی آوازیں نکال سکتا ہے اور اپنا پیغام دیگر ہم جولیوں تک پہنچاتا ہے۔

پچھلی چھ دہائیوں سے لوگ خرگوش کو پالتو جانور کی طرح پالتے ہیں۔ پچھلے دس سالوں میں برطانیہ میں گھروں میں پالے جانے والے پالتو جانوروں میں خرگوش تیسرے نمبر پر ہے۔

خرگوش وزن اور سائز کے اعتبار میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ سائز میں یہ آٹھ انچ یعنی تقریباً بیس سینٹی میٹر سے لے کر بیس انچ یعنی پچاس سینٹی میٹر تک ہوتے ہیں۔ ان کا وزن بھی جسامت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ دو پونڈ سے لے کر گیارہ پونڈ تک وزنی ہوتے ہیں۔

خرگوش اپنی یادداشت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ پُرانی سے پُرانی بات بھی اپنے دماغ میں ذہن نشین رکھتے ہیں۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ خرگوش کو تربیت یافتہ جانور بھی بنایا جا سکتا ہے۔ گھریلو پالتو خرگوش کو مختلف قسم کے کرتب بھی سکھائے جا سکتے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً دس سال ہوتی ہے۔

☆☆☆

اصیل مرغے کی ایک ٹانگ

ایک باورچی جب بھی مرغ کا سالن پکاتا، مالک کے لئے مرغ کی ایک ہی ران ڈال کر لے جاتا۔ ایک روز اتفاق سے مالک کے ساتھ کوئی مہمان بھی کھانے میں شریک تھا، اس کے باوجود باورچی ڈونگے میں ایک ہی ران ڈال کر لایا۔ مالک نے اعتراض کیا کہ ''آج تو مہمان بھی ہے اور تم پھر ایک ٹانگ سالن میں ڈال کر دسترخوان پر لائے ہو، پہلے تو خیر میں چپ رہتا تھا کہ کوئی بات نہیں، ایک ٹانگ تم اپنے لئے رکھ لیتے ہو، تمہارا بھی جی چاہتا ہوگا مرغ کی ران کھانے کو مگر تم ایسے خود غرض آدمی ثابت ہوئے کہ مہمان کا بھی لحاظ نہ رکھا!''

باورچی خاصا چالاک آدمی تھا۔ مالک کی اس سرزنش پر ذرا شرمندہ نہ ہوا، بلکہ ڈھٹائی سے بولا:

''نہ صاحب! میں نے کبھی اپنا لالچ نہیں کیا، نہ کبھی اپنے لئے مرغ کا سالن بچا کر رکھا، ہمیشہ پورا سالن دسترخوان پر آپ کے سامنے لاتا ہوں۔''

''مگر ران تو ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے سالن میں.....'' مالک حیران ہو کر بولا۔

''حضور! میں ہمیشہ آپ کے لئے اصیل مرغا لے کر آتا ہوں کیوں کہ یہ ذائقے میں بھی اچھا ہوتا ہے اور اس کا گوشت عام مرغ سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔'' باورچی نے کہا۔

''ارے بھائی! بات تو ہو رہی ہے مرغے کی ایک ٹانگ کی، تم اس کی صفتیں گنوانے بیٹھ گئے۔''

مالک نے چڑ کر کہا تو باورچی فوراً بولا: ''لیجئے حضور! آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اصیل مرغ کی ایک ہی ٹانگ ہوتی ہے۔''

کچھ دنوں بعد باورچی مالک کے ساتھ بازار جا رہا تھا۔ راستے میں ایک میدان میں کچھ مرغیاں اور مرغے دانہ چگ رہے تھے۔ ایک طرف ایک مرغ ایک ٹانگ پر کھڑا اونگھ رہا تھا۔ باورچی نے مالک سے کہا:

''وہ دیکھئے صاحب! وہ ہے اصیل مرغا، دیکھا آپ نے اس کی ایک ہی ٹانگ ہے۔''

مالک نے قریب سے گزرتے ہوئے منہ سے ''شی'' کی آواز نکالی تو مرغے نے جھٹ دوسری ٹانگ پَروں سے باہر نکالی اور ڈر کر بھاگ گیا۔

''مالک نے باورچی کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ؟''

''صاحب! مجھے کیا پتا تھا کہ ''شی'' کہنے سے مرغے کی دوسری ٹانگ نکل آئے گی ورنہ ذبح کرنے سے پہلے میں بھی ایسا ہی کرتا۔ ویسے تو اصیل مرغے کی ٹانگ ایک ہی ہوتی ہے۔''

اس باورچی کی طرح جب کوئی اپنی بات پر اڑا رہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی تو وہی بات ہے کہ اصیل مرغے کی ایک ٹانگ۔ ☆☆

معذوری عیب نہیں

بلال شیخ

عبدالسمیع پیدا ہوا تو والدین کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی، امجد کے گھر بیٹا ہوا تھا۔ پانچ سال بعد اللہ نے انہیں یہ انمول تحفہ دیا تھا۔ ہر طرف سے مبارک بادیں موصول ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی اس کی خوشی میں خوش نظر آ رہا تھا۔ خالہ پاس ہی بیٹھی تھی، بولی۔ ''پورا میرے امجد جیسا لگ رہا ہے۔ وہی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ماشاء اللہ!''

امجد نے خالہ کو دیکھ کر کہا۔ ''جی خالہ! آپ کی ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

امجد نے اپنے بیٹے کا نام ''عبدالسمیع'' رکھا اور سب لوگ اس کا یہ نام سن کر بہت خوش تھے اور اس نام سے متفق بھی تھے۔ امجد کی بیوی بانو بھی اپنے لال کو دیکھ دیکھ کر دعاؤں سے زبان تر رکھتی۔

عبدالسمیع جب ڈیڑھ سال کا ہوا تو گھر میں عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ سب کے سب خاموش سے ہو گئے، جیسے کسی نے ان کی خوشی کو ڈس لیا ہو۔ پہلے تو یہ بات چھوٹی لگی لیکن جیسے جیسے عبدالسمیع بڑا ہوا امجد اور بانو کی پریشانی بڑھتی گئی۔ عبدالسمیع بول نہیں پا رہا تھا۔ سب اس کو کچھ کہتے تو اس کے منہ سے آواز نہ نکلتی۔ ڈاکٹرز کو چیک کروایا تو پتا چلا عبدالسمیع بول نہیں سکتا تھا، وہ پیدائشی گونگا تھا۔ جب یہ بات امجد اور بانو کے کانوں میں گئی تو دونوں کو ایسا لگا جیسے کسی نے پاؤں تلے سے زمین نکال لی ہو۔ بانو یہ بات سن کر کئی دن روتی رہی اور امجد اس کو کسی نہ کسی طرح حوصلہ دیتا رہا۔

''حوصلہ رکھو بانو! جس نے پیدا کیا ہے، وہی اس کو پالنے والا بھی ہے۔'' امجد بانو کو چپ کرواتے ہوئے بولا۔

بانو، امجد کی بات سن کر چپ تو کر جاتی تھی لیکن وہ ماں تھی، اس کا دل امجد کے مقابلے میں بہت نازک تھا۔ جب امجد چلا جاتا تو بہت افسردہ ہوتی۔

امجد نے بانو کا روتا چہرہ دیکھا تو گھر سے باہر چلا گیا۔ گھر کے دروازے پر دو سیڑھیاں بنی ہوئی تھی۔ امجد ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر اور اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آسمان پر چاند کو نم آنکھوں سے دیکھنے لگ گیا۔ کافی دیر وہ اپنے بیٹے عبدالسمیع کے بارے میں سوچتا رہا اس نے عزم کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو وہ مقام دے گا جس کا وہ حق دار ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو گونگا نہیں رہنے دے گا۔ وہ زبان سے گونگا ہوا تو کیا، وہ خیالات سے گونگا نہیں اور اس نے عبدالسمیع کے لیے

کمر کس لی۔

عبدالسمیع جب چار سال کا ہوا تو امجد نے اسے گاؤں سے تھوڑا سا دُور اسپیشل اسکول جو گونگے بہرے بچوں کے لیے تھا، عبدالسمیع کا داخلہ اس اسکول میں کروا دیا جس پر بانو بہت خوش تھی۔

''دیکھنا بانو، ہمارا بیٹا اب گونگا نہیں رہے گا۔'' امجد نے بانو کو مسکراتے ہوئے چہرے سے کہا۔ ''اللہ میرے بیٹے کو بہت کام یاب انسان بنائے جی۔'' بانو دعائیں دے رہی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور عبدالسمیع زندگی کی دوڑ میں آگے چل رہا تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ گھومنے کی غرض سے گھر سے باہر چلا گیا۔ گلی میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب ان لڑکوں نے اس کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک لڑکا بولا۔ ''کون ہے بھائی تو؟'' عبدالسمیع سے بولا نہیں جاتا اور اگر بولتا تو ''اوں آ'' جیسی آوازیں نکلتیں۔ عبدالسمیع نے ہاتھ کے اشارے سے بات کی اور منہ سے کچھ آوازیں نکالیں تو لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے۔ ''ہاہاہا! یہ تو گونگا ہے۔'' ایک لڑکے نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پیچھے سے ایک لڑکے نے اس کے سر پر زور سے تھپڑ مارا۔ عبدالسمیع نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو لڑکا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ ''چل، ابے گونگے کیا گھور رہا ہے۔'' لڑکا اس کے پاس آیا تو عبدالسمیع نے غصے سے اس کی طرف جوابی کارروائی کرنی چاہی مگر دوسری جانب سے کسی اور لڑکے نے اس کو دھکا دے دیا اور وہ زور سے زمین پر گر گیا۔ جب وہ زمین پر گرا تو لڑکے کھڑے اس پر ہنس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ ''ابے بول ناں! ٹائم کیا ہوا ہے؟''

''ارے یہ کیا بولے گا، یہ تو گونگا ہے۔'' عبدالسمیع کی زمین پر بیٹھے آنکھیں نم ہو گئیں اور آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے گرنے لگے اور وہ معصومیت بھرے چہرے سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اسلم اِدھر پہنچ گیا اور اس نے سب لڑکوں کو بھگا دیا۔ عبدالسمیع کو اُٹھایا، اس کے کپڑے صاف کیے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گیا۔

اسلم، عبدالسمیع کو لے کر گھر پہنچا تو بانو، عبدالسمیع کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کے بکھرے بال اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولی۔ ''ارے! کیا ہوا، تجھے کسی نے کچھ کہا ہے؟'' عبدالسمیع کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے گر رہے تھے اور روتا ہوا وہ اپنی ماں کے ساتھ لگ گیا۔ ''اماں! اس کو گھر سے اکیلے نہ نکلنے دیا کر، باہر لڑکے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔'' اسلم نے بانو کو ساری بات بتائی۔ بانو، عبدالسمیع کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا پتر گھبرانا نہیں، تجھے ہمت نہیں ہارنی، میرا پتر کمزور نہیں اور نہ رونے والوں میں سے ہے۔ گونگا تو معاشرہ ہے جو اپنی گندگی چھپانے کے لیے دوسروں پر گندگی اُچھالتا ہے، میرا پتر بہادر ہے۔ اس معاشرے سے ڈرے گا نہیں، لڑے گا۔'' عبدالسمیع اپنی ماں کے ہر لفظ کو اپنے دل پر اُتار رہا تھا اور اپنے آپ سے وعدہ کر رہا تھا کہ میں اس معاشرے

میں قابل انسان بن کر جیوں گا، کسی کا محتاج ہوں گا اور نہ ہی کسی سے مدد کی توقع رکھوں گا۔

وقت گزرتا رہا، عبدالسمیع نے اپنا وقت تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اگر اس دُنیا میں جینا ہے تو اپنے آپ کو منوانا ہو گا۔ عبدالسمیع اپنے اسکول میں تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ کھیل کے میدان میں بھی کافی آگے جا رہا تھا۔ اس نے کرکٹ میں بہت عمدہ کارکردگی دکھائی تھی اور حساب میں وہ بہت ذہین تھا۔ کوئی حساب کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو، عبدالسمیع کے لیے معمولی بات تھی۔ امجد اپنے بیٹے کو انعامات وصول کرتے دیکھتا تو اس کا سر فخر سے اُونچا ہو جاتا اور دل کو راحت ملتی۔

عبدالسمیع نویں جماعت میں پہنچا تو اس کے اسکول میں مقابلے کا اعلان ہوا جو حساب میں دل چسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے تھا۔ عبدالسمیع نے اس میں حصہ لینے کے لیے محنت شروع کر دی۔ بانو اپنے بیٹے کی خوراک میں بالکل کوتاہی نہیں کرتی تھی۔ مختلف قسم کی چیزیں بناتی جو دماغ کی طاقت کے لیے مفید ہوتیں اور پابندی کے ساتھ کھلاتی۔ روزانہ رات کو اس کا ماتھا چوم کر جاتی۔

امتحان کا دن تھا اور عبدالسمیع نے خوب دل لگا کر محنت کی تھی اور وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کو اپنے اوپر اتنا بھروسا ہو چکا تھا کہ وہ کسی میدان میں بھی اپنے بلند حوصلوں کے ساتھ آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا سکتا تھا۔ عبدالسمیع نے امتحان دیا اور پورے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ یہ بات گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ امجد اور بانو اپنے لال کو چوم رہے تھے اور خوشی کے آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ امجد کے گھر کے باہر میڈیا والے بھی آ گئے تھے اور عبدالسمیع کی تصاویر تمام چینلز پر دکھائی جا رہی تھیں۔

''میں نہ کہتی تھی، ایک دن میرا بیٹا بہت نام کمائے گا۔'' بانو فخر سے اپنی ہمسائی سکینہ کو کہہ رہی تھی۔ ہر طرف سے مبارک باد کا سلسلہ جاری تھا۔ کوئی امجد کو گلے لگا رہا تھا تو کوئی بانو کو مبارک دے رہا تھا اور عبدالسمیع کے اردگرد ہجوم اکٹھا تھا۔ ہر کوئی اس کے ساتھ تصاویر بنوانا چاہتا تھا۔

عبدالسمیع نے انٹر کرنے کے بعد گھر میں چھوٹے سے کمرے میں ریاضی کی ٹیوشن کھول لی، جو بچے اس مضمون میں ٹیوشن لینا چاہتے تو آ جاتے اور اس طرح یہ ایک کمرے سے ایک اکیڈمی کی شکل اختیار کر گئی اور عبدالسمیع ایک اچھا اُستاد مانا جانے لگا۔

عبدالسمیع کی محنت اس بات کا ثبوت ہے کہ جو لوگ ثابت قدمی، مضبوط قوتِ ارادی سے کام لیتے ہیں اور اپنا کام اللہ کے سپرد کرتے ہیں، وہ لوگ کبھی اس دُنیا میں ذلیل نہیں ہوتے اور عبدالسمیع نے یہ بات ثابت کر دی کہ زبان سے گونگا ہونا کوئی عیب نہیں مگر خیالات سے گونگا ہونا ایک عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی انسان کو کسی جسمانی معذوری میں مبتلا کر دیتا ہے تو اسی انسان میں دوسری خوبیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عبدالسمیع کو زبان تو نہ دی لیکن اسے اچھے خیالات، محنت اور ہمت سے نوازا تھا۔

☆☆☆

کنجوس کا مال

ایک مال دار سوداگر اس قدر کنجوس تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی بلی بھی اس کے گھر آتی تو اسے بھی روٹی کا ایک ٹکڑا نہ ڈالتا اور اگر اصحاب کہف کا کتا بھی آتا تو چوڑی ہوئی ہڈی اس کے آگے نہ ڈالتا۔ مہمانوں کے لیے اس کا دروازہ ہمیشہ بند اور دسترخوان لپٹا ہوا رہتا تھا۔

ایک بار اس نے سامانِ تجارت جہاز پر لادا اور ملک مصر کی طرف روانہ ہوا۔ غرور سے اس کی گردن یوں اکڑی ہوئی تھی کہ گویا اس زمانے کا فرعون ہو۔ اسے پکا یقین تھا یہ تجارتی سفر اس کے لیے بہت زیادہ نفع رساں ثابت ہو گا لیکن ہوا یہ کہ جب وہ آدھا راستہ طے کر چکا تو سمندر میں طوفان آ گیا اور اس بخیل کا جہاز غرق ہو گیا۔ طوفان کے آثار دیکھ کر اس بخیل نے بہت دعائیں مانگیں لیکن دعاؤں سے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ ایسے شخص کی دعا کب قبول ہوتی ہے جس کے ہاتھ مانگنے کے لیے تو خدا کے سامنے پھیل جائیں لیکن کسی کو کچھ دینا پڑتا ہو تو بغلوں میں چھپا لیے جاتے ہوں۔

اس بخیل کا چھوڑا ہوا مال اور جائیداد اس کے ان غریب رشتے داروں کے ہاتھ آئی جنھیں اس نے زندگی میں کبھی نہ پوچھا تھا اور وہ خوب شان و شوکت سے زندگی گزارنے لگے۔ ☆☆☆

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

انور بیگ ایک بہت بڑی حویلی کے مالک تھے۔ نوکر چاکر، سجا سجایا گھر، بے شمار کمرے، باغیچے اور راہ داریاں تھیں۔ یہ حویلی شہر سے کچھ دُور تھی، لہٰذا روزمرہ اشیاء کی خریداری کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ یہاں اکثر پھیری والے گھریلو اشیاء بیچنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ حویلی کے مکین بھی انھی سے اشیاء خریدتے تھے۔

پیارے بچو! آپ کو معلوم ہے کہ چور وغیرہ اکثر بھیس بدل کر چوریاں کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ گھر والوں سے آنکھ بچا کر گھس جائیں اور چوری کریں۔ اب ہوا یوں کہ ایک پھیری والا دراصل چور تھا اور پھیری والے کا بھیس بدل کر اکثر حویلی کے اردگرد منڈلاتا تھا۔ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے کچھ کمرے تھے۔

پھیری والا ایک دن چوکی دار کی غیر موجودگی میں حویلی کے اندر چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ اچانک چوکی دار کی نظر پڑی کہ کوئی حویلی کے اندر گیا ہے۔ بات غیر معمولی تھی۔ چوکی دار نے فوراً تھانے کے سپاہی کو اطلاع دی۔ سپاہی شیر دل، انور بیگ کے ساتھ آیا اور حویلی کی تلاشی لینے لگا۔ چوکی دار کو شک تھا کہ چور سامنے کے کمروں کی طرف گیا ہے، لہٰذا شیر دل نے وہیں سے تلاشی لی۔ اب وہ ایک ایسے کمرے میں گیا جہاں صرف ایک اسٹول تھا اور اس پر گل دان تھا۔ شیر دل نے کمرے کا جائزہ لیا اور چور کو پکڑ لیا۔ پیارے بچو! سوچ سمجھ کر بتائیے کہ چور کا کیسے پتا چلا؟

پیارے بچو! نومبر 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب ہے: شتر مرغ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- سید نور علی شاہ، ملتان
2- عریشہ اسد، رحیم یار خان
3- سجاد کریم، رحیم یار خان
4- حمزہ احمد، راول پنڈی۔
5- لائبہ نواز، کھاریاں

مرغی اور پنیر کے گول کباب

اجزاء:

مرغی کا قیمہ: 1/4 کلو
لال مرچ پاؤڈر: 1/2 چائے کا چمچ
ٹھنڈا دودھ: 2 کھانے کے چمچ
نمک: حسب ذائقہ

پنیر کی فلنگ:

چیڈر پنیر، کدوکش کیا ہوا: ایک پیالی
شملہ مرچ، باریک کٹی ہوئی: ایک عدد بڑی
پودینہ، باریک کٹا ہوا: ایک کھانے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ
ہری مرچ، باریک کٹی ہوئی: 5 عدد
لال مرچ پاؤڈر: 1/2 چائے کا چمچ
لہسن پاؤڈر: ایک چائے کا چمچ

آمیزے کے لیے:

انڈا، پھینٹا ہوا: ایک عدد
ٹھنڈا دودھ: 2 کھانے کے چمچ
لال مرچ پاؤڈر: 1/4 چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ
بریڈ کرمز: حسب ضرورت
تیل: تلنے کے لیے

ترکیب:

قیمہ میں لال مرچ، نمک اور دودھ ملا کر چالیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پنیر کی فلنگ بنانے کے لیے تمام اجزاء کو ملالیں اور فریج میں رکھ دیں۔ ایک پیالی میں انڈا، دودھ، لال مرچ اور نمک پھینٹ لیں۔ ہتھیلیوں کو تیل سے تھوڑا چکنا کر لیں اور پیڑے کو بند کر لیں۔ اس طرح سارے پیڑے تیار کر لیں۔ ان پیڑوں کو انڈے کے آمیزے میں ڈبو کر بریڈ کرمز لگائیں۔ درمیانی آنچ پر گہرا سنہری ہونے تک تلیں۔ چلی گارلک ساس کے ساتھ گرم پیش کریں۔

پودینہ اور لیموں کے ساتھ مرغی کے کٹلٹس

اجزاء:

مرغی کا قیمہ: 1/2 کلو
لیموں کا رس: تین کھانے کے چمچ
ہری مرچ، باریک کٹی ہوئی: چھ عدد
دھنیا اور پودینہ، باریک کٹا ہوا: تین کھانے کے چمچ
لال مرچ پاؤڈر: ایک چائے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
تیل: تلنے کے لیے
نمک: حسب ذائقہ

ترکیب:

مرغی کے قیمہ میں تیل کے علاوہ تمام اجزاء ملالیں اور چالیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ قیمہ سے گول کٹلٹس بنالیں۔ تیل گرم کریں اور دھیمی آنچ پر دونوں طرف سے تل کر سنہرا کر لیں۔ ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ اس عمارت کا نام بتائیں جس میں قائداعظمؒ کی پیدائش ہوئی۔

i۔ وزیر مینشن ii۔ قائداعظم ہاؤس iii۔ ممبئی ہاؤس

2۔ قائداعظمؒ کی والدہ کا نام کیا تھا؟

i۔ مٹھی بائی ii۔ رتنا بائی iii۔ امی بائی

3۔ قائداعظمؒ کی مادری زبان کون سی تھی؟

i۔ پنجابی ii۔ اُردو iii۔ گجراتی

4۔ قائداعظمؒ اسکول کے زمانے میں کون سا کھیل کھیلتے تھے؟

i۔ کرکٹ ii۔ فٹ بال iii۔ ہاکی

5۔ قائداعظمؒ کی عوامی سطح پر سال گرہ کب منائی گئی؟

i۔ 25 دسمبر 1940ء ii۔ 25 دسمبر 1941ء iii۔ 25 دسمبر 1942ء

6۔ قائداعظمؒ کے ذاتی معالج کا نام کیا تھا؟

i۔ کرنل ڈاکٹر اللہ بخش ii۔ کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش iii۔ ڈاکٹر الٰہی

7۔ ''جناح'' کا کیا مطلب ہے؟

i۔ دُبلا پتلا ii۔ فربہ iii۔ دراز قد

8۔ قائداعظمؒ نے کس اخبار کی بنیاد رکھی؟

i۔ دی ٹائمز ii۔ ڈان iii۔ جنگ

9۔ قائداعظمؒ کی نمازِ جنازہ کس نے پڑھائی؟

i۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ii۔ مولانا محمد علی جوہر iii۔ لیاقت علی خان

10۔ ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح''، نظم کس نے لکھی؟

i۔ میاں بشیر احمد ii۔ اکبر الٰہ آبادی iii۔ علامہ اقبالؒ

جوابات علمی آزمائش نومبر 2016ء

1۔ تعریف کیا گیا 2۔ اسکاٹ لینڈ 3۔ طارق کی دُعا 4۔ دھاگہ نما
5۔ سرگودھا 6۔ 20 نومبر 7۔ پروفیسر آرنلڈ 8۔ امیر خسرو
9۔ وٹامن ڈی 10۔ امام بی بی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ صباحت فاطمہ، حویلی لکھا (150 روپے کی کتب)
☆ ارسلان منظور، چکوال (100 روپے کی کتب)
☆ عبداللہ ساجد، گوجرانوالہ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
حذیفہ شہید، سیال کوٹ۔ افہام علی، شیخوپورہ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ زیرا امجد، راول پنڈی۔ سید تیمور علی خالد، مریم فاطمہ، جھنگ صدر۔ ہادیہ عمران، لاہور۔ آمنہ رضوان، گوجرانوالہ۔ آیت اللہ ورک، لاہور۔ محمد عمر فاروق، سیال کوٹ۔ آمنہ جمال، لاہور۔ محمد حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ اصباح شاہد، لاہور۔ میمونہ جاوید، گجرات۔ ملیحہ نور، لاہور۔ عمیرہ ہارون، نوشہرہ۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ طلال عاقل، وہاڑی۔ صبا ضیاء، اسلام آباد۔ حنیف الرحمٰن، راول پنڈی۔ عمر فاروق، واہ کینٹ۔ فرحان ظفر، سرگودھا۔ کشف مریم، لاہور۔ ماریہ نوید، فیصل آباد۔ عائشہ شہزاد، لاہور۔ محمد بلال، فیصل آباد۔ عاشر علی ہاشمی، لاہور۔ تحریم نور، گجرات۔ عبدالرحمٰن بن ممتاز، لاہور۔ مریم قزلباش، اسلام آباد۔ ربیعہ توقیر، کراچی۔ سید محمد حسین شاہ، کراچی۔ طہٰ یٰسین، حیدر آباد۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ تہنیت آفرین، منڈی بہاؤ الدین۔ طلحہ محمود ملک، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ اسد اللہ، اٹک۔ ایمہ فجر قریشی، میر پور آزاد کشمیر۔ اقراء شمس، راول پنڈی۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ منیبہ افضل مغل، گوجرانوالہ۔ خدیجہ تحریم بنت عبدالشکور، رینالہ خورد۔ ثمن نثار، زویان نثار، راول پنڈی۔ شازیہ ہاشم، قصور۔ نور العین، پشاور۔ عبدالرحیم، پیرمحل۔ رابعہ امین، رحیم یار خان۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ سندس آسیہ، کراچی۔ محمد معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ناصرہ مقدس، شیخوپورہ۔ محمد صدیق قیوم، قصور۔ محمد حامد رضا المصطفیٰ، چنیوٹ۔ عادل آصف، قصور۔ رافعہ قدوس، طلحہ قدوس، بہاول پور۔ شہر یار کفیل، گوجرانوالہ۔ اسد اللہ ساجد، گوجرانوالہ۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ محمد آصف، موچھ۔ مہر اکرم، لاہور۔ وجیہہ بابر شفیق، سرگودھا۔ جریر جنید، ہانیا آصف، لاہور۔ حماد طلعت، سرگودھا۔ علیشبہ صدیقی، ملتان۔ خالد محمود، قصور۔ ماہ نور عاصم، فیصل آباد۔ انیلا شہزادی، ردا بٹ، لاہور۔ مریم عبدالسلام شیخ، نواب شاہ۔ علینا اختر، کراچی۔ نجم السحر، منڈی بہاؤ الدین۔ بنت محمد وحید، راول پنڈی۔ سیدہ دل آویز، پشاور۔ حیدر حنیف، سیال کوٹ۔ محمد شاہ نواز اکرم یوسف زئی، ملک محمد احسن، انوشہ خالد، راول پنڈی۔ حیدر علی، لاہور۔ احمد بلال، چنیوٹ۔ محمد شمعون بٹ، لاہور۔ طہٰ عبداللہ، طلحہ خالد، گوجرانوالہ۔ زہرہ بتول، بہاول پور۔ حفصہ حسینی، کلورکوٹ۔

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہیں دُور ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو اپنی روزی روٹی کے لیے ہر وقت سینے پرونے میں مصروف رہتی۔ ایک دن اس نے سرخ رنگ کی کچھ اُون خریدی جس کا رنگ اسے اتنا بھایا کہ اس اُون سے اس نے ایک چادر بُننے کا ارادہ کیا، لہٰذا اس نے چادر بنانا شروع کر دی۔ کئی ہفتوں کی محنت کے بعد آخرکار چادر تیار ہوگئی جو بہت خوب صورت تھی۔ جس دن چادر تیار ہوئی، ٹھیک اسی دن ایک بگھی جسے گھوڑے کھینچ رہے تھے، اس بوڑھی عورت کے گھر کے سامنے سے گزری۔ اس بگھی میں اس ملک کی ملکہ سوار تھی جو بہت خوب صورت اور نیک خاتون تھی۔ اس نے بڑا دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا لیکن وہ لباس اتنا گرم نہیں تھا۔

جب بگھی بوڑھی عورت کے گھر کے سامنے سے گزری تو ملکہ کو تین دفعہ چھینک آئی۔ وہ بولی۔ ''میں بھی کتنی بے وقوف ہوں جو گرم کپڑے پہن کر محل سے نہیں نکلی۔ اب میں ضرور بیمار ہو جاؤں گی۔'' بوڑھی عورت کے کان بہت تیز تھے۔ اس نے ملکہ کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ سن لیا۔ انتہائی عجلت میں اس نے چادر ہاتھ میں لی اور گھر سے باہر گلی میں آئی۔ بگھی ابھی تھوڑی دُور ہی گئی تھی جب عورت نے پیچھے سے کوچوان کو آوازیں دیں۔ ''کوچوان، بھائی کوچوان! ذرا بگھی روکو!'' کوچوان نے آوازیں سنیں اور حیران ہو کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ملکہ نے بھی یہ آوازیں سن لی تھیں اور جب اس نے ایک بوڑھی عورت کو بگھی کے پیچھے آتے دیکھا تو اس نے کوچوان کو بگھی روکنے کا کہا تاکہ معلوم کر سکے کہ آخر کیا مسئلہ ہے۔ بگھی رُک گئی تو بوڑھی عورت تیز تیز چلتے ہوئے بگھی کے پاس آئی اور اس نے ملکہ کو درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ''ملکہ عالیہ! آپ کو سردی لگ رہی ہے، میرے پاس یہ اُونی چادر ہے جو میں نے آج ہی مکمل بُنی ہے۔ میری طرف سے اسے تحفہ سمجھ کر رکھ لیجیے اور اسے پہنیے تاکہ آپ سردی سے بچ سکیں۔'' ملکہ نے بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کیا اور چادر قبول کر لی اور اس سے اپنے شانوں کو ڈھک لیا۔ اس نے بوڑھی عورت کو کہا۔ ''یہ چادر کتنی خوب صورت اور گرم ہے۔ مجھے اسے اوڑھ کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ بگھی میں بیٹھو اور میرے ساتھ محل میں چلی چلو۔'' بوڑھی عورت یہ الفاظ سن کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس

نے جلدی جلدی تیاری کی اور ملکہ کے ساتھ بگھی میں سوار ہو گئی۔ محل میں گزرا وقت بوڑھی عورت کے لیے بہت یادگار تھا۔ ادھر سرخ اُونی چادر بھی ملکہ کے شانوں سے لپٹی بہت فخر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے انتہائی خوشی سے ملکہ کے شانوں کو بھینچا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''میں ہمیشہ ملکہ کو سردی سے بچاؤں گی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ ملکہ نے مجھے اوڑھا ہوا ہے۔'' ملکہ کو اپنی سرخ اُونی چادر سے بہت محبت تھی۔ پانچ سال تک ملکہ بڑے شوق سے چادر کو اوڑھتی رہی اور چادر کے بھی وارے نیارے رہے کیوں کہ اس کا بہت خیال کیا جاتا تھا۔ ہر ہفتے اسے اچھی طرح دھو کر پیار سے سکھایا جاتا اور اگر ذرا بھی کوئی سوراخ چادر میں نظر آتا تو فوراً اس کی مرمت کر دی جاتی لیکن پانچ سال گزرنے کے بعد ایک دن ملکہ نے چادر کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگی۔ ''میری پیاری چادر! اب مجھے تمہیں خیر باد کہنا پڑے گا۔ تم بہت پُرانی ہو گئی ہو۔ جگہ جگہ سے تم اب پھٹنے ہی والی ہو۔ مجھے تمہیں کسی کو دینا پڑے گا۔'' یہ سن کر چادر بے چاری دل مسوس ہو کر رہ گئی۔ اس نے آئینے میں خود پر نگاہ ڈالی۔ واقعی وہ بہت پُرانی لگ رہی تھی اور اب وہ اس قابل نہیں تھی کہ ملکہ اسے اوڑھے۔

اگلے ہفتے ایک پُرانی خادمہ ملکہ کے پاس رہنے کے لئے آئی تو ملکہ نے سوچا کہ چادر خادمہ کو دے دینی چاہیے کیوں کہ اس کی پہنی ہوئی کالی چادر سردی روکنے کے لائق نہیں تھی۔ سرخ چادر پُرانی ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ کالی چادر سے گرم تھی۔ اس طرح خادمہ نے شکریہ ادا کر کے ملکہ سے وہ چادر لی اور محل میں رہتے ہوئے اسے روز اوڑھتی رہی۔ جب وہ محل سے روانہ ہوئی تو چادر اپنے ساتھ لے گئی۔ پہلے پہل تو چادر ملکہ کو دل کی گہرائیوں سے یاد کرتی رہی لیکن جلد ہی اس کی خادمہ سے گہری چھننے لگی۔ خادمہ کی بہت سی سہیلیاں تھیں جو اسے کہتیں کہ وہ خوش قسمت ہے جو ملکہ کی پہنی ہوئی چادر اوڑھتی ہے۔ چادر کو اب بھی ہر ہفتے دھویا جاتا تھا اور اس کی مرمت بھی وقت پر کی جاتی تھی لیکن خادمہ کی نظر اب کمزور ہو چکی تھی، لہٰذا اس کے لگے پیوند اب چادر پر بہت بھدے لگتے۔ کچھ ہی دنوں میں چادر پُرانی لگنے لگی جس پر جا بجا گلابی، سبز اور نیلے پیوند صاف نظر آتے تھے۔ ایک دن خادمہ نے ایک عورت کو دیکھا جس کی گود میں اس کا نوزائیدہ بچہ تھا۔ وہ عورت بہت غریب تھی اور اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ اپنے بچے کو اوڑھاتی جو اس کی گود میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ خادمہ نے اسے کہا۔ ''تم میری یہ گرم چادر لے لو لیکن اس کا خیال رکھنا کیوں کہ یہ خود ملکہ نے مجھے دی تھی۔ اس میں بچے کو لپیٹ لو۔ یہ چادر اسے ٹھنڈ نہیں لگنے دے گی۔'' لہٰذا ایک دفعہ پھر سرخ چادر دوسرے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اب وہ بچے کی اوڑھنی بن گئی۔ ہر روز بچے کو وہ چادر اوڑھا دی جاتی۔ جب چادر کو اس کے ننھے ہاتھ کھینچتے تو چادر کو عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا۔ جب وہ تین سال کا ہو گیا تو اس کی ماں نے چادر کو ایک الماری میں پھینک دیا۔ وہ بہت گندی ہو چکی تھی کیوں کہ بچے کی ماں نے اسے صرف ایک دفعہ دھویا تھا۔ اس میں جابجا سوراخ ہو چکے تھے۔ کسی نے بڑی مدت سے اس کی مرمت نہیں کی تھی۔ وہ ہفتوں الماری میں پڑی رہی۔

ایک دن اس عورت کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت پھول بیچنے آئی تو بچے کی ماں نے اسے کہا۔ ''مجھے پھول نہیں چاہئیں۔ میرے پاس انہیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔'' لیکن پھول والی نے کہا۔ ''ذرا ان پھولوں کو دیکھیں تو سہی، یہ کتنی پیاری کلیاں ہیں۔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں تو مجھے کوئی پُرانا کوٹ یا چادر ہی دے دیں۔'' بچے کی ماں کو فوراً پُرانی چادر یاد آ گئی۔ وہ دوڑ کر گئی اور الماری سے چادر نکال لائی۔ چادر سمجھی کہ شاید پھر بچے کے ڈھانپنے کے لیے اس کی ضرورت آن پڑی ہے۔ وہ ہفتوں سے تنہائی کا شکار اور مایوس تھی۔ ماں نے کہا۔ ''لو، یہ لے لو۔ یہ پُرانی چادر اگر تم پسند کرو تو بدلے میں مجھے پھول دے دو۔'' پھول والی نے فوراً چادر لے لی اور اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اس نے بچے کی ماں کو پھول دیئے اور پھر اپنا راستہ ناپا۔ چادر دوبارہ کسی جسم کو آرام پہنچانے سے خوش ہو رہی تھی۔ اس نے پھول بیچنے والی عورت کو ڈھانپ لیا۔ پھول بیچنے والی عورت بے چاری سردی کی ماری ہوئی تھی۔ اس نے چادر کو پیار سے بھینچا تو چادر بہت مطمئن ہوئی کہ کوئی تو ہے جسے اس کی ضرورت ہے۔ پھر اگلے چھ ماہ سرد ہواؤں اور بارش میں پھول بیچنے والی عورت اسے اوڑھے دربدر پھرتی رہی۔ چادر بارش کے پانی میں بھیگتی رہتی اور سورج کی شعاعیں تو کئی دفعہ اسے جلا ہی دیتیں لیکن وہ مطمئن تھی کیوں کہ اسے پتا تھا کہ پھول بیچنے والی کو اس کی ضرورت تھی۔ پھر ایک دن

کسی نے غریب عورت کو پہننے کے لیے ایک خوب صورت کوٹ ترس کھا کر دے دیا۔ اس نے چادر اُتار کر پھینک دی اور کوٹ پہن لیا۔ اس نے چادر کو بالکل بھلا دیا۔ چادر اب ایک گڑھے میں گری پڑی تھی جو راستے میں تھا۔ وہاں وہ کئی ہفتے پڑی رہی۔ وہ بہت افسردہ تھی۔ اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب ملکہ اسے پہنا کرتی تھی اور پھر اسے وہ سبھی مہربان لوگ یاد آئے جو اسے شوق سے پہنتے تھے۔ اسے ملکہ کی خادمہ یاد آئی جو ہر ہفتے اسے بہت احتیاط سے دھوتی تھی۔ اسے وہ بچہ یاد آیا جو اس میں لیٹا، اس سے کھیلا کرتا تھا اور آخر میں اسے پھول بیچنے والی کی یاد آئی جو سخت ترین موسموں میں اسے اوڑھا کرتی تھی۔

گڑھے میں پڑی ایک بھولی بسری یاد کی طرح چادر نے ٹھنڈا سانس لیا۔ وہاں قریب ہی فصلوں میں ایک کسان نے ڈراؤنا بنا کر کھڑا کیا ہوا تھا جس نے سر پر ایک پُرانا ہیٹ پہنا ہوا تھا اور شاخوں سے بنے دو بازو تھے۔ وہ فصلوں کے عین وسط میں کھڑا تھا تاکہ پرندوں کو فصلیں خراب کرنے سے ڈرا کر روکے۔ وہ ہمیشہ خوش رہنے والی چیز تھی اور کام کے دوران گنگناتا رہتا تھا۔ اسے کسان نے چھڑیوں سے بنا رکھا تھا اور سر کی جگہ بڑا سا کدو رکھا ہوا تھا۔ تیز ہوا چلنے سے پھڑپھڑاتا تو یوں لگتا کہ وہ خوشی سے نہال ہو رہا ہے۔ پھر ایک دن ایک آوارہ گرد وہاں آیا، اس نے ڈراؤنے کو دیکھا جس کا کوٹ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ آوارہ گرد نے دل میں سوچا کہ اس ڈراؤنے کا کوٹ اس کے پہنے ہوئے کوٹ سے بہتر ہے۔ اس نے ڈراؤنے کا کوٹ اُتار کر خود پہن لیا۔ ڈراؤنا بے چارہ کوٹ کے بغیر بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اب وہ صرف چھڑیوں اور ایک ہیٹ پر مشتمل تھا اور اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہوا میں کھڑا کانپتا رہا۔ پھر اس نے چھینکنا شروع کر دیا۔

وہ ایک دفعہ تو اتنی زور سے چھینکا کہ اس کا کدو سے بنا سر بھی اس کے جسم سے الگ ہو کر زمین پر گرنے لگا تھا۔ چادر اس کی حالت دیکھ کر تھوڑا سا سرکی اور اس نے گڑھے سے باہر جھانکا۔ اسے ڈراؤنے کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش کسی طرح وہ ڈراؤنے کے قریب جا سکے اور اس سے باتیں کر کے اس کا حال پوچھے۔ پھر چادر کو ایک بہترین ترکیب سوجھی۔ چادر نے پکارا۔ ''اے تیز چلنے والی ہوا! ذرا تھوڑا سا اور تیز ہو جا۔'' ہوا نے اس کی بات مانی اور اسے سرکاتی ہوئی ڈراؤنے کے پاس لے آئی۔ ڈراؤنے نے چادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اے پیاری سرخ چادر! ذرا اور نزدیک آ جاؤ۔ کاش کسی طرح میں تمہیں جسم کے گرد لپٹا سکتا جس سے مجھے تھوڑی راحت ملتی۔'' لیکن چادر کے بس میں بھلا یہ کہاں تھا اور ہوا بھی اس کی مدد نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک صبح کسان فصلوں کو دیکھنے کھیت میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈراؤنے کے بدن پر کوٹ نہیں ہے۔ اس نے قریب پڑی چادر کو دیکھا۔ جلدی سے اس نے چادر کو اُٹھایا اور اسے ڈراؤنے کے شانوں پر لپیٹ دیا۔ ڈراؤنا اور چادر دونوں بہت خوش تھے۔ (بقیہ صفحہ نمبر 22)

اختر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ان کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ اختر کے ابو ایک کارخانے میں کام کرتے تھے۔ وہ کم پڑھے لکھے آدمی تھے مگر تعلیم کی اہمیت جانتے تھے۔ وہ اور ان کی بیوی یعنی اختر کی امی چاہتے تھے کہ ان کا اختر خوب پڑھ لکھ کر قابل اور بڑا آدمی بنے۔ اختر ایک ذہین بچہ تھا اور لائق طالب علم تھا۔ وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے والدین بلکہ اپنے اسکول کے اساتذہ کی آنکھوں کا بھی تارا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا شوق دیکھ کر اس کے والدین اور اساتذہ جان گئے تھے کہ اختر پڑھ لکھ کر ایک دن بڑا آدمی ضرور بنے گا جو معاشرے کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ اختر کا اسکول اس کے گھر سے تقریباً پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ننھا اختر اپنا بستہ گلے میں لٹکائے روزانہ خوشی خوشی پیدل اسکول آتا جاتا تھا۔ ایک دن وہ اسکول سے چھٹی کے بعد گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اسے ایک کتا ایک درخت کے آس پاس خود رو جھاڑیوں میں اپنا منہ مارتا نظر آیا، وہ شاید کھانے کے لیے کوئی شے تلاش کر رہا تھا۔ لگتا تھا وہ کافی بھوکا تھا۔ اختر کو اس کتے پر بے اختیار رحم آ گیا۔ اس نے جھٹ بستے کے اندر سے اپنا ٹفن نکالا۔ آج امی نے انڈے کا آملیٹ اور روٹی بنا کر ٹفن بکس میں رکھی تھی۔ اختر نے بریک ٹائم میں آملیٹ کے ساتھ آدھی روٹی کھائی تھی۔ آج اسے زیادہ بھوک نہیں تھی۔ آدھی روٹی بچ گئی تھی۔ اختر نے ٹفن بکس سے بچی ہوئی آدھی روٹی نکالی اور اس بھوکے کتے کے قریب پھینک دی۔ کتے نے جھاڑیوں میں منہ مارنا بند کیا اور فوراً آدھی روٹی پر جھپٹا اور جلدی جلدی کھانے لگا۔ کتا واقعی کافی بھوکا تھا۔ اختر کی پھینکی ہوئی روٹی اس کے لیے بڑی غنیمت ثابت ہوئی تھی۔ روٹی کھانے کے بعد وہ کتا اختر کی طرف دیکھ کر اپنی دُم ہلانے لگا، گویا اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ اختر اس کتے سے ذرا بھی نہ ڈرا۔ اختر کو وہ کتا بے ضرر قسم کا نظر آتا تھا۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا، پھر اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ دوسرے دن صبح اسکول جاتے ہوئے اختر کو اسی جگہ وہی کتا پھر دکھائی دیا۔ اختر کے دل میں فوراً ایک خیال آیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ٹفن بکس سے کھانے کا کچھ حصہ نکالا اور اس کتے کے آگے ڈال دیا۔ کتا بڑی رغبت سے اسے کھانے لگا۔ آج اختر کے ٹفن بکس میں روٹی کے علاوہ مرغی کے

گوشت کی بوٹیاں بھی تھیں۔ کتے کو اپنے ٹفن بکس سے کچھ کھانا ڈالنا اختر نے روزانہ کا معمول بنا لیا۔ وہ اسکول آتے یا واپس گھر جاتے ہوئے اس درخت کے قریب ضرور رُکتا تھا۔ اس کتے کا مستقل ٹھکانہ یہی درخت والی جگہ تھی۔ جس دن اسکول آتے یا گھر واپس جاتے ہوئے اختر کو وہ کتا وہاں نظر نہ آتا تو وہ اس کے حصے کا کھانا اس درخت کے تنے کے قریب رکھ دیتا تھا تاکہ وہ کتا جب بھی کھانے کی وہ چیز دیکھے تو اسے کھا لے۔ جب سے اختر نے اپنے ٹفن بکس سے اس کتے کو کھلانا شروع کیا تھا، وہ اپنی امی سے اپنے ٹفن بکس میں زیادہ کھانا رکھواتا تھا۔ اس کی سیدھی سادی امی سمجھی تھی کہ شاید اسکول میں اختر کو زیادہ بھوک لگنے لگی ہے۔

شہر میں بچوں کے اغواء کی وارداتیں ہونے لگی تھیں، کچھ جرائم پیشہ عناصر چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے اپنے مذموم مقاصد پورے کر رہے تھے۔ ملک کے مستقبل کے ننھے معماروں کی زندگیاں ختم کر رہے تھے۔ جن ماؤں کے بچے اغوا ہوئے تھے، وہ روتی پیٹتی بین کرنے لگیں۔ شہر میں خوف کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ مائیں اپنے چھوٹے بچوں پر ہر وقت نظر رکھنے لگی تھیں۔ بچوں کے اغواء میں ملوث جرائم پیشہ عناصر کا خاتمہ کرنے کے لیے پولیس فوراً حرکت میں آ چکی تھی۔ شہر کے تقریباً تمام اسکولوں کی طرح اختر کے اسکول کی انتظامیہ نے بھی ہدایت جاری کر دی تھی۔ نیز بچوں کے والدین کو بھی اطلاع کر دی تھی کہ موجودہ سنگین حالات کے پیشِ نظر وہ خود اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے آئیں اور چھٹی کے بعد گھر واپس لے کر جائیں۔ اختر کے ابو اسے صبح اسکول چھوڑنے اور چھٹی کے بعد اسے واپس گھر لانے کی ذمے داری نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ وہ جس کارخانے میں کام کرتے تھے، وہ ان کے گھر سے کافی دُور تھا۔ وہاں وقت پر پہنچنے کے لیے انہیں منہ اندھیرے گھر سے نکلنا پڑتا تھا اور واپسی رات کو ہوتی تھی۔ اختر جب ابتدائی جماعتوں میں پڑھتا تھا، اس وقت امی ہی اسے اسکول چھوڑتی اور گھر واپس لاتی تھی۔ پھر جب اختر تھوڑا سا بڑا ہو گیا تو وہ اکیلا ہی اسکول جانے لگا۔ اب صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اختر کی امی کو اسے اسکول چھوڑنے اور گھر لانے کی ذمہ داری دوبارہ اپنے اوپر لینی پڑی کیوں کہ اختر ابھی بچہ ہی تو تھا۔ پہلے دن امی کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے اختر کو وہ کتا جسے وہ کھانا ڈالتا تھا، اس درخت کے آس پاس نظر نہیں آیا لیکن واپسی پر امی کے ہمراہ آتے ہوئے وہ کتا اختر کو دکھائی دیا۔ اختر پل بھر کے لیے رُک گیا۔ اس ٹفن بکس سے بچا ہوا کھانا نکال کر اس کتے کے آگے ڈال دیا۔ وہ کتا دُم ہلاتے ہوئے اسے کھانے لگا۔ اختر کی امی نے حیران نظروں سے یہ منظر دیکھا اور پھر اختر سے بولی۔

''بیٹا! یہ تم نے کیا کیا۔ اپنا کھانا اس کتے کو ڈال دیا۔''

''امی! میں تو روزانہ اس کتے کو کھانا ڈالتا ہوں۔ یہ بے چارہ بھوکا ہوتا ہے ناں۔'' ننھے اختر نے معصومیت سے جواب دیا۔

''لیکن بیٹا کتا ایک خطرناک جانور ہے، یہ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' امی نے کہا۔ ''امی کافی دن ہو گئے ہیں مجھے اس کتے کو کھانا ڈالتے ہوئے، ابھی تک اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ویسے بھی میں اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا۔ بس اسے کھانا ڈالتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔'' اختر نے بتایا۔ پھر آنے والے دنوں میں اختر کی امی نے اختر کو باقاعدگی سے اس کتے کو کھانا ڈالتے دیکھا تھا۔ وہ کتا بھی اب اختر سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔ اسے پہچاننے لگا تھا کیوں کہ اختر اسے کھانے کو کچھ نہ کچھ ضرور ڈالتا تھا۔ جیسے ہی وہ کتا دُور سے اختر کو اپنی طرف آتے دیکھتا تو وہ اپنی دُم ہلاتے ہوئے اس کے قریب چلا جاتا تھا۔ اب دن یوں ہی گزرنے لگے تھے۔ چھوٹے بچوں کے اغوا کی وارداتوں میں نمایاں کمی ہو گئی تھی لیکن ابھی بھی اکا دکا واردات ہو جاتی تھی۔ پولیس کے محکمے نے ٹھان لی تھی کہ جب تک بچوں کے اغوا کی سنگین وارداتوں میں ملوث ظالم عناصر کا جڑ سے قلع قمع نہیں کرے گا، چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس سلسلے میں بچوں کے والدین پولیس کی اب تک کی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ ادھر پولیس کا محکمہ اپنے کام میں لگا رہا۔ ننھے اختر نے اپنی ساری توجہ پڑھنے لکھنے میں رکھی۔

جماعت میں ہونے والے ماہانہ ٹیسٹ میں اس نے شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ اساتذہ اس کی شان دار کامیابی پر بہت خوش تھے۔ اختر اب بھی اس کتے کو کھانا ضرور ڈالتا تھا۔ یہ ایک روشن دن تھا۔ ننھا اختر اسکول سے واپس گھر کی طرف آ رہا تھا۔ آج اس کی امی اس کے ہمراہ نہیں تھی بلکہ پچھلے دو دنوں سے اختر اکیلا ہی اسکول جا رہا تھا کیوں کہ اس کی امی اچانک سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اختر اس درخت کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ رُکنے کا مقصد اس کتے کو کھانا ڈالنا ہی تھا۔ صبح اسکول

جاتے ہوئے اسے وہ کتا وہاں نظر نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ کتا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اختر چند قدم مزید چلا۔ اس نے سامنے دیکھا تو اسے دو مشکوک اجنبی آدمی اپنی طرف آتے دکھائی دے رہے تھے۔ درحقیقت وہ اغوا کار تھے اور ننھے معصوم اختر کو اغواء کرنا چاہتے تھے۔ اختر انہیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر سہم گیا۔ اس کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی امی کو بار بار پکارنا چاہ رہا تھا مگر مارے ڈر کے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ارد گرد ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ان لمحوں میں وہ راستہ سنسان تھا۔ ان دونوں خطرناک مشکوک آدمیوں نے اپنے ہاتھ اختر کی جانب بڑھا دیئے۔ ایک نے ننھے اختر کے نازک کندھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ معصوم اختر ان کے آگے بے بس تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس موقع پر وہ کتا جسے اختر روزانہ کھانا ڈالتا تھا، بڑے ڈرامائی انداز میں اچانک کہیں سے نمودار ہوا اور انتہائی جارحانہ انداز میں غراتے ہوئے ان دونوں مشکوک آدمیوں پر حملہ کر دیا۔ وہ دونوں آدمی اس اچانک افتاد پر حواس باختہ ہو گئے۔ کتے نے ایک آدمی کے اس بازو پر دانت گاڑ دیئے۔ اس نے چیختے ہوئے اختر کو چھوڑ دیا۔ پھر کتا دوسرے آدمی کی ایک ٹانگ اپنے جبڑوں میں لے کر جھنجھوڑنے لگا۔ وہ آدمی بھی چیخنے چلاّنے لگا۔ ان کی چیخ پکار نے اس وقت وہاں سے گزرتے ہوئے دو موٹر سائیکل سواروں کو رُکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ایک کار والا بھی اچانک اپنی کار روک کر وہاں کی صورت حال کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اس جگہ سے کچھ دُور چند دُکانیں تھیں۔ ایک دُکان دار نے اپنی دُکان سے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اس نے دوسرے دُکان داروں کی توجہ بھی اس منظر کی جانب مبذول کرائی۔ وہ سب اپنی دُکانوں سے نکل کر اس جگہ پہنچ گئے۔ آن کی آن میں وہاں خاصا مجمع لگ گیا تھا۔ کتے نے ان دونوں مشکوک آدمیوں کو خاصا زخمی کر دیا تھا۔ وہ زمین پر گرے ہوئے تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ وہ کتا اب وہاں سے ہٹ کر آہستہ آہستہ بھاگتا ہوا درخت تلے چلا گیا اور دُم ہلاتا ہوا اختر کو دیکھ رہا تھا۔ معصوم اختر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی اختر کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''بچہ ڈر گیا ہے۔'' پھر اس نے پیار بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''بیٹا! کیا ہوا تھا؟'' ''انکل! یہ دو آدمی مجھے پکڑنا چاہتے تھے مگر کتے نے ان پر حملہ کر دیا۔'' ننھے اختر نے ان دونوں زخمی آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دونوں اب لوگوں کے گھیرے میں تھے۔ ان کے لیے وہاں کوئی راہ فرار نہیں تھی۔

''یہ اغوا کار ہیں۔ بچوں کو اغوا کرتے ہیں۔ ان کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔'' مجمع میں سے کسی نے کہا۔ ''پولیس کے حوالے تو بعد میں کریں گے پہلے ہم ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔'' ایک آدمی نے ان دونوں اغوا کاروں کو مکے اور لاتیں زور زور سے پڑنے لگیں۔ اتنے میں کسی نے 15 پر کال کر کے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس جلد ہی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ساری صورت حال کا

اچھی طرح جائزہ لیا پھر نشان دہی پر ان دونوں زخمی اغوا کاروں کو فوراً گرفتار کر کے لے گئی۔ کچھ دیر بعد مجمع چھٹنے لگا۔ لوگ دھیرے دھیرے اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی جس نے اختر کے سر پر ہاتھ رکھا تھا، اس نے اختر سے کہا۔ ''بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ تم اغوا ہونے سے بال بال بچ گئے ہو۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟ میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس ادھیڑ عمر آدمی کے شفقت آمیز لب و لہجے سے ننھے اختر کا خوف کافی کم ہو گیا تھا۔ افراتفری میں اسے کتے کو کھانا ڈالنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ پھر جیسے ہی اسے یاد آیا اس نے ادھیڑ عمر آدمی سے کہا۔ ''انکل! ایک منٹ۔''

پھر اس نے اپنے ٹفن بکس سے بچا ہوا کھانا نکالا اور درخت کے قریب جا کر کتے کے آگے ڈال دیا جسے کتا کھانے لگا۔ ننھا اختر اس کتے کو روزانہ کھانا ڈالتا تھا۔ آج اس بے زبان جانور نے بھی اختر کی اس نیکی کا اسے خوب بدلہ دیا تھا۔ وہ کتا آج ننھے اختر کو اغواء کرنے والوں کے آگے مضبوط ڈھال بن گیا تھا۔ اس کتے نے اساتذہ اور والدین کی آنکھوں کے تارے، ایک لائق طالب علم اور ملک کے مستقبل کے ذہین اور قابل معمار کو اغوا کاروں کے ہتھے چڑھنے سے بچا لیا تھا اور اغوا کاروں کے گھناؤنے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا۔

پیارے بچو! نیکی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی مشکل میں اس کا بدلہ ضرور دیتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں......؟

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

اسد اللہ، اٹک۔ احمد فراز ملک، چکوال۔ شاہ میر، ڈی آئی خان۔ طیبہ وحید، منڈی بہاؤ الدین۔ محمد حسن محمود، لاہور۔ طہٰ عبداللہ، گوجرانوالہ۔ ماہ نور نبیل، رینالہ خورد۔ احمد بلال، جھنگ۔ عدن سجاد، لاہور۔ ہانیہ آصف، لاہور۔ طوبیٰ راشد، کراچی۔ ربیعہ توقیر، راول پنڈی۔ دانیا خالد، کراچی۔ آبلہ نور محمد فیصل، کراچی۔ زینب محسن، یسریٰ نوید، نواب شاہ۔ مریم عبدالسلام شیخ، دیپال پور۔ عبداللہ لودھی، لاہور۔ عیشہ راضیہ قاسمی، قصور۔ شازیہ ہاشم، لاہور۔ حسن وقاص، پیرمحل۔ عبدالرحیم، چنیوٹ۔ ایمان حیدر، خوشاب۔ مسفرہ علی بنت رانا رضوان علی، شیخوپورہ۔ ماحد فہیم، لاہور۔ آمنہ عمران، راول پنڈی۔ زیرا امجد، لاہور۔ مریم ہاشمی، گجرات۔ تحریم نور، لاہور۔ فارحہ احتشام، لاہور۔ عائشہ صدیقہ، راول پنڈی۔ ملک علی اعوان، اسلام آباد۔ محمد مبشر، کوہاٹ۔ محمد عمار عثمان، واہ کینٹ۔ شعیب نذیر، رحیم یار خان۔ راول پنڈی۔ بادیہ عمران، لاہور۔ اریبہ نسیم، راول پنڈی۔ بادیہ جاوید، گجرات۔ صارم الاسلام کیانی، میرپور آزاد کشمیر۔ خنسہ قدوس، بہاول پور۔ طلحہ قدوس، ملک وال۔ نجم السحر، لاہور۔ ایمان فاطمہ، فیصل آباد۔ ماریہ نوید، لاہور۔ طلحہ قطب، پشاور۔ وجیہہ الیاس، جھنگ صدر۔ سید تیمور علی خالد، رحیم یار خان۔ ادیبہ حسن، نوشہرہ۔ جام سید مکتوم شاہ، مریم فاطمہ، کلورکوٹ۔ بشریٰ حسینی، خنسہ حسینی، جھنگ۔ مریم فاطمہ، حیدر آباد۔ مقدس خان، خوشاب۔ فضل سبحان، واہ کینٹ۔ حمیرا ریاست، کراچی۔ سیدہ جویریہ علی، پور۔ سید عبداللہ بن حافظ محمد حذیفہ، سیال کوٹ۔ محمد فرقان جمال، راول پنڈی۔ جریر جنید، لاہور۔ خدیجہ تحریم، رینالہ خورد۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ عروج، میانوالی۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ محمد اویس رضا، راول پنڈی۔ محمد شاہ میر لیاقت، سیال کوٹ۔ اسد عبداللہ، ملتان۔ ہلال خان ناصر، گوجرانوالہ۔ معظم، راول پنڈی۔ صبا ضیاء، وہاڑی۔ عدین عاقل، شیخوپورہ۔ ابو ہریرہ، چکوال۔ لبنیٰ منظور، رحیم یار خان۔ ازکہ مریم، ہری پور۔ بی بی ہاجرہ، لاہور۔ حافظ ام حبیبہ بنت کلیم اللہ بلوچ، منڈی بہاؤ الدین۔ تہنیت آفریں، میانوالی۔ ملک محمد فہیم، چنیوٹ۔ محمد سعد خالد، راول پنڈی۔ ثمر نثار، جہلم کینٹ۔ رانیم سلطان، لاہور۔ مہر اکرم، اسلام آباد۔ علی حمزہ صفدر، لاہور۔ ردا بٹ، خانیوال۔ محمد ابراہیم، راول پنڈی۔ مسفرہ ظفر، خانیوال۔ حفصہ رزاق، قصور۔ محمد صدیق قیوم، لاہور۔ محمد سعد، ملتان۔ عرفان احمد، حریم طلحہ خالد، گوجرانوالہ۔ طلحہ محمود ملک، لاہور۔ مریم مصطفیٰ، رحیم یار خان۔ انیلا شہزادی، لاہور۔ حفیظ اللہ، ڈیرہ غازی خان۔ فائزہ رزاق، خانیوال۔ گجرات۔ مکرم ایمن کائنات، ڈیرہ غازی خان۔ وجیہہ کاکاخیل، پشاور۔ علینا اختر، کراچی۔ محمد معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ ثاقب، گوجرانوالہ۔ درسرینہ ثاقب، لاہور۔ علیحہ سکندر، اسلام آباد۔ محمد خبیب، ڈیرہ غازی خان۔ عبداللہ، مردان۔ عبیرہ شاہد، راول پنڈی۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ احمد خان، کراچی۔ زویا رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ مشعال آصف، لاہور۔ ناظرہ مقدس، شیخوپورہ۔ مطیع اللہ، لاہور۔ نوال خان، ڈیرہ غازی خان۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور کینٹ۔ راول مہیب الرحمٰن، اسلام آباد۔ غازی عبداللہ، لاہور۔ کشف مریم، سیال کوٹ۔ محمد منیب ستار، نوشہرہ۔ بتول فراز، راول پنڈی۔ علی حنظلہ، راول پنڈی۔ احمد، محمد صہیب خالد محمود، قصور۔ محمد اویس، فیصل آباد۔ محمد شاہ نواز اکرم یوسف زئی، راول پنڈی۔ شاملہ مرتضیٰ علوی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ فاطمہ عمر، ملتان۔ محمد عطر، لاہور۔ پنڈی۔ محمد احزم ہاشمی، ملتان۔ خالد محمود، وہاڑی۔ امامہ شبیر، فیصل آباد۔ فرحان ظفر، سرگودھا۔ ارحم فرید، فیصل آباد۔ احجر خان، نوشہرہ۔ لاریب دلدار، چکوال۔ امین، جھنگ۔ وجیہہ بابر شفیق، گوجرانوالہ۔ منیبہ افضل مغل، میانوالی۔ ازکیٰ تحریم، اسلام آباد۔ جویریہ شیر علی، گوجر خان۔ اقراء شمس، واہ کینٹ۔ عمر فاروقی، لاہور۔ عبدالحفیظ، رحیم یار خان۔ ابراہیم اکبر خان، موچھ۔ محمد آصف، سرگودھا۔ حماد طلعت، اوکاڑہ۔ سعد اللہ، اسلام آباد۔ صفا الماس، لاہور۔ ملیحہ نور، فیصل آباد۔ کشف جاوید، سرگودھا۔ دانیال حسن، لاہور۔ مریم بنت کاشف، حیدر آباد۔ فاعمہ تحریم، کراچی۔ محمد بن حسن، لاہور۔ سید محمد احمد، گجرات۔ علی شاہ زین، سیال کوٹ۔ مرحبا شمس، خان۔

عمل سے زندگی بنتی ہے

خدیجہ مدثر، سیال کوٹ

''دادو! دادو بتائیں ناں! کیسی لگی میری تقریر؟ لیبر ڈے پر لکھی میری تقریر اچھی ہے ناں! دادو مجھے ضرور فرسٹ پرائز ملے گا۔'' عمیر جوشیلے انداز میں اپنی دادو سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے اسکول میں بھی ''لیبر ڈے'' پر فنکشن ہو رہا تھا۔ اس نے اسی سلسلے میں دھواں دار تقریر تیار کی تھی اور وہی تقریر اپنی دادو کو سنانے کے بعد ان سے داد لینا چاہ رہا تھا۔

''بیٹا! لکھا تو آپ نے ٹھیک ہے مگر آپ اپنے کہے گئے الفاظ پر عمل بھی کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔'' دادو بولیں۔

''کیا مطلب دادو! آپ کہنا چاہ رہی ہیں کہ میں بھی لیبرز کی مدد کروں؟ لیکن دادو میں کوئی این جی او تھوڑی چلاتا ہوں جو ان کی مدد کروں۔'' عمیر نے حیرت سے کہا۔

''دیکھو بیٹا! ضروری نہیں جو این جی او کا مالک ہو، وہی محنت کشوں کی مدد کرے اور صرف مزدوری کرنے والے ہی محنت کشوں میں شمار نہیں ہوتے۔'' دادو نے کہا۔ عمیر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دادو کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔

''ہمارے گھر کام کرنے والی ماسی نسیم کا بیٹا بھی تو آپ کا ہم عمر ہے ناں! لیکن وہ چپ چاپ رہتا ہے۔ اسکول نہیں جا سکتا۔ چھوٹے موٹے گھریلو کام کرتا ہے۔ عمیر! وہ بھی تو انسان ہے۔ آخر اس کا دل بھی تو اسکول جانے کو، کھلونوں سے کھیلنے کو کرتا ہوگا۔''

''جی دادو! میں کیا کروں؟ پاپا انہیں تنخواہ دیتے تو ہیں۔'' عمیر نے کہا۔

''دیکھو بیٹا! روزِ محشر ہم میں سے ہر ایک نے اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ اگر ان کا گزارہ اس تنخواہ میں ہوتا تو وہ اسکول جاتا۔ بیٹا! اگر ہم اہلِ ثروت میں شمار ہوتے ہیں تو یہ اللہ کی رحمت ہے۔ وہ اپنے بندوں کو اسی طرح آزماتا ہے اور جانتے ہو کہ ہمارے دین میں تو کوئی اونچ نیچ، ذات پات کو اہمیت و فضیلت حاصل نہیں۔ میں تم سے یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم اپنی استطاعت کے مطابق جذبہ خلوص سے اپنے بھائی کی مدد کرو۔''

''مگر دادو! میں کیا کر سکتا ہوں اس کے لیے؟''

''آپ اسے پڑھا سکتے ہو، جب وقت ملے اس کے ساتھ کھیلا کرو، اسے اپنی اترن دینے کی بجائے ایک نیا جوڑا لے دیا کرو تو تمہیں سچی خوشی ملے گی۔'' دادو نے کہا۔

''جی دادو! سمجھ گیا۔ میں آج ہی ارسلان سے بات کروں گا۔ ہم ارسلان کو اچھا انسان بننے میں مدد کریں گے تو کل کو وہ بھی نیکی کی شمع روشن کرے گا اور اسی طرح ایک دن ضرور ہمارے ملک سے چائلڈ لیبر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ روزِ محشر کو ہم اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو سکیں گے۔'' عمیر نے پُر امید لہجے سے کہا۔

''بالکل! اور اب مجھے یقین ہے کہ تمہارے اس نیک عزم کے بعد ''لیبر ڈے'' پر تمہاری تقریر کو فرسٹ پرائز ضرور ملے گا۔ آخر تمہارا عمل بھی تو شامل ہوگا! اللہ تمہیں کام یاب کرے۔'' دادو نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

اپنی مدد آپ

حفصہ اعجاز، صوابی

ماں نے بے بسی سے اپنے بیٹے خالد کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔ ''بیٹا! ایسا مت کہو، تمہارے ابا جان کی خواہش تھی، تم پڑھ لکھ کر بہت بڑے آدمی بنو۔'' ماں کی بات سن کر خالد نے زور سے سر جھٹکا اور تیز لہجے میں کہنے لگا: ''امی جان! اس دُنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں، جن کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی خواہشات کو دل کے قبرستان میں دفن کر لیتے ہیں۔ امی جان! میں جانتا ہوں کہ میرے ابا جان مجھ سے بے تحاشا محبت کرتے تھے، اس لیے میں نے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں مگر امی جان! اب اگر میں مزید تعلیم جاری رکھوں گا تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا اور میرے بہن بھائی کیسے اپنی تعلیم جاری رکھیں گے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کو علم کی روشنی سے محروم نہیں رکھنا چاہتا اور آپ کی خواہش

میرے بہن بھائی علی، احمد اور وردہ پوری کریں گے۔" بیٹے کی باتیں سن کر ماں کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

خالد اُٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر بہت آبدیدہ ہوا۔ دل میں سوچنے لگا کہ کاش! میں یتیم نہ ہوتا، میرے سر سے شفقت کا سایہ نہ اُٹھتا۔ اس نے دل میں پختہ عہد کیا۔ وہ اپنے گھر کا چولہا بجھنے نہیں دے گا اور تعلیم کو خیر باد کہہ کر ابا جان کی جگہ سارا خرچہ برداشت کرے گا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا۔ امی جان اندر آئیں۔ امی جان نے کہا۔ "خالد بیٹا!" خالد ایک دم چونک گیا اور کہنے لگا۔ "امی جان! آپ میرے کمرے میں کب آئیں؟" امی جان مسکرائیں اور بولیں۔ "میں نے سوچا ایک دفعہ پھر کوشش کر لوں، میرے چاند! بس تم پڑھو، تمہارے لیے میں محنت کروں گی۔"

"امی جان! میرے ہوتے ہوئے آپ محنت کریں گی۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کتنی ہی مائیں ہیں جو اپنے لختِ جگر پال رہی ہیں۔ بیٹا! ہم سب مل کر محنت کریں گے اور تم لوگ اپنی تعلیم بھی جاری رکھو گے۔"

ایک ماہ پہلے یہ گھرانہ مکمل اور خوش تھا۔ خالد اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے ابا جان آرمی میں آفیسر تھے۔ وہ اپنا کام ایمان داری سے کرتے تھے۔ ناجائز کاموں اور فائدوں سے ہمیشہ دُور رہتے تھے۔ ایک رات وہ اپنے گھر لوٹ رہے تھے کہ قریب سے گزرتی ہوئی ایک کالے رنگ کی کار سے ان پر فائرنگ کی گئی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ ان کے انتقال کے بعد خالد نے محسوس کیا کہ جب تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا، گھر کی گاڑی نہیں چلے گی۔ اس نے سوچا تھا کہ کیا وہ صرف کام ہی کرے گا۔ چناں چہ خالد صبح اسکول جاتا، شام کے وقت دُکان پر کام کرتا۔ اس کی امی جان دن بھر کپڑے سلائی کرتی رہتی تھی۔ زندگی کی گاڑی یوں ہی چلتی رہی، کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اپنا لوہا منوا لیا۔ انٹر میں اچھے نمبر لینے کے بعد خالد ماں کے کہنے پر ڈاکٹر بننے لگا اور کام یابی کے میدان میں جھنڈے گاڑتا چلا جا رہا تھا۔ ماں اس کے لیے ہر وقت دعا کرتی تھی۔ خالد اب خالد نہیں بلکہ ڈاکٹر خالد بن چکا تھا۔ یہ سب اس کی محنت، ہمت اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج وہ شہر کے سب سے بڑے معروف اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ یتیم اور غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے۔ اس کے بہن بھائی بھی اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ سب ان کی ہمت اور محنت کا نتیجہ تھا اور اب وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جو لوگ کرتے ہیں محنت زیادہ
وہ دُنیا میں پاتے ہیں عزت زیادہ

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

جگرِ شاہین

حافظ حسین عبداللہ، لاہور

نعمان رنج بھرے جذبات لیے، افسردہ خیالات کے ساتھ گلاب کے چمن میں کھڑا تھا۔ آج نعمان کا دل بہت اُداس تھا۔ والدین کے شفقت بھرے سائے سے محروم ہونے کے بعد جب قرابت داروں نے منہ پھیر لیا تو وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوا اس باغ میں نکل آیا جہاں کبھی وہ اپنے والد کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ ایک نظر اس نے سبزے پر پھیلے گلابوں پر ڈالی اور گزشتہ زندگی کی کتاب اس کے سامنے ورق در ورق کھلنے لگی۔

اس نے متوسط طبقے میں آنکھ کھولی۔ وہ دن اس کے والدین کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا جس دن نعمان پیدا ہوا۔ آخر اتنے عرصے بعد ان کی مراد بر آئی تھی۔ بڑے نازوں سے پالا۔ نعمان کے والد کسی دُکان میں حساب کتاب کا کام کیا کرتے تھے۔ تنخواہ اتنی تھی کہ بس گزارہ ہو جاتا تھا۔ کبھی چار پیسے آتے تو گھر میں گوشت کی خوش بو بھی اُٹھتی تھی ورنہ وہی دال دلیا۔ والدین اکثر اوقات خود فاقہ کر لیتے مگر اپنے فرزند کو پیٹ بھر کر کھلایا کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب نعمان کی اسکول جانے کی عمر ہوگئی۔ والدین نے اس کو پڑھانے کے خواب آنکھوں میں سجائے، پیسے کے بندوبست کے لیے کئی دروازے کھٹکھٹائے مگر جواب نفی میں ملتا۔ اب نعمان کے والد نے کسی دوسری دُکان پر بھی منشی کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ بڑھاپا آ گیا تھا مگر اپنے چاند سے بیٹے کی خاطر اپنی صحت کی کچھ پروا نہ کی۔ نعمان اب بڑا ہو چکا تھا۔ عالمِ شباب میں قدم رکھا تو والدہ کے انتقال کی صورت میں ایک بڑے حادثے کا سامنا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو۔ آخر یہ زخم بھی بھر گیا۔ دن مہینوں میں اور مہینے سال میں بدلتے گئے۔ نعمان پڑھتا گیا۔ اپنے بیٹے کے آسودہ مستقبل کا سوچ کر اس کے والد نے بھی اپنی صحت قربان کر دی۔ نعمان کو بھی احساس تھا کہ اس کے والد اسے پیٹ کاٹ کر پڑھا رہے ہیں اور وہ دل لگا کر پڑھتا گیا۔ اب بھی اکثر اوقات وہ گلابوں کے گلستان میں جایا کرتا تھا۔ آخر نعمان کی پڑھائی تکمیل کو پہنچی اور نوکری ڈھونڈنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ کئی دروازے کھٹکھٹائے مگر سفارش نہ ہونے کے باعث ہر بار ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ باپ بے چارہ چارپائی پر لیٹا ہی کھانستا رہتا۔

نعمان کے والد کی طبیعت بھی روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ علاج معالجے کا بندوبست کہاں سے ہوتا کہ جب گھر میں پیسے ہی نہ ہوں۔ آخر ایک دن نعمان کے والد کو بھی دل کا دورہ پڑا اور وہ نعمان کو روتا چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اپنا افسردہ ماضی لیے اس نے اسی گلابوں کے چمن کا رُخ کیا جہاں کبھی وہ اپنے والد کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ گلاب کے پودے اب بھی اس کے سامنے لہلہا رہے تھے مگر جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کسی بھی چیز کا لطف نہیں آتا۔ کافی دیر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا مگر تاریکی کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اپنی زخموں سے چُور زندگی کی طرف اس نے افسردہ قدم اُٹھائے۔ ایک نظر پیچھے گھوم کر دیکھا تو ایک بلبل کو شاخ پر گیت گاتے پایا۔ اس کے ترنم میں شاید یہ صدا تھی:

"اے انسان! تو کس قدر نادان ہے۔ تیری زندگی میں ذرا سی رکاوٹیں آئیں تو تُو گھبرا جاتا ہے۔ کیا تجھے نہیں خبر کہ رکاوٹ ہے تو حرکت ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ سات رنگی دُنیا قائم ہے۔ مصائب سے مت گھبرا کیوں کہ ستارے ہمیشہ اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔ اگر تیری زندگی میں رکاوٹیں ہوں تو تیری خودی کی صحیح تعمیر ہوگی۔ اگر تیری زندگی میں مشکلات نہ ہوں تو تُو اپنی قابلیت سے ناآشنا رہے گا۔ گوشۂ عافیت کا متلاشی رہا تو تیری خودی بیدار نہیں ہوگی۔ تو دریا کی تلاطم خیز موجوں سے ٹکرا کر اپنا مقصد زندگی تلاش کر۔ کمزور نہ بن کہ لوگ تجھے اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا لیں۔ اپنے کردار کو اس قدر بلند کر کہ اس خاکی سے فرشتے بھی رشک کھائیں۔ کنارے کی تمنا نہ کر بلکہ دریا کے درمیان میں رہ کر موجوں سے ٹکرا۔ اسی امر سے تو مقصد حیات پانے میں کامیابی حاصل کر سکے گا۔ یاد رکھ، اپنے وجود کو مٹی کی کشش سے آزاد رکھ۔ اگرچہ تو خاکی ہے مگر خاک سے آزاد رہ۔ اپنے سینے میں کمزور دل نہیں بلکہ شاہین کا پختہ جگر پیدا کر۔"

نعمان نے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ بلبل کو دیکھا اور اپنی کانٹوں بھری زندگی کا جگر شاہین کی طرح مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر کے قدم بڑھا دیئے۔ اب اس کی زندگی کا مستقبل روشن تھا۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

بونا

جویریہ ثنا، مظفر گڑھ

اسے دسویں جماعت میں پہلا انعام ملا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی اس نے اپنا آٹھ سالہ ریکارڈ قائم کر رکھا تھا اور اسی خوشی میں جلد از جلد وہ اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا کہ یک دم ایک آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس کا کلاس فیلو عامر اپنے گروپ کے ساتھ کھڑا اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ "جی، عامر بھائی!" عبداللہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یار تم اس ٹرافی کے ذریعے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہے ہو؟" عامر تمسخر بھرے انداز میں اس کے ہاتھ سے ٹرافی چھینتے ہوئے بولا۔ اس نے بھی بچپن میں ڈاکٹر بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ "میری اماں کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں اور لوگوں کا مفت علاج کروں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بات پر عامر سمیت سب گروپ فیلوز کا زوردار قہقہہ لگا۔ "فرض کرو، اگر تم ڈاکٹر بن بھی جاؤ تو اوور آل پہن کر کیسے لگو گے؟ بونا ڈاکٹر...... مریضوں کے قدموں میں رلتا ہوا بونا ڈاکٹر......" ایک بار پھر ان سب کا قہقہہ بلند ہوا۔ اس کے چہرے پہ ایک تاریک سا سایہ لہرایا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ اس نے گھاس پر پڑی ٹرافی اُٹھائی جو عامر نے چھیننے کے بعد گھاس پہ پھینک دی تھی اور کسی بھی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اماں اس کے ہاتھ میں ٹرافی دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئیں۔

اس نے ہاتھ مار کر سامنے میز پر پڑی ٹرافی کو نیچے پھینک دیا جو اماں آتے ہوئے کمرے میں ساتھ لے آئی تھیں۔

''کیا ہوا؟ بیٹا! مجھے کچھ تو بتاؤ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اتنی خوشی کے موقع پر میرا بچہ اس قدر اداس کیوں ہے؟'' اس نے دوپہر والا سارا قصہ اماں کے گوش گزار کر دیا۔ ''اماں! کیا چھوٹے قد والوں کو زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''بیٹا! یہ سب قدرت کے کیے ہوئے فیصلے ہیں اور ہر چیز اس کے کیے کی محتاج ہے۔ ہم انسان اس کی بنائی ہوئی چیز ہیں، وہ ہمارا مالک ہے۔ وہ جس طرح بنائے، ہم اس کے کام میں کیسے مداخلت کر سکتے ہیں۔ یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ وہ قدرت کے کاموں میں عمل دخل کر کے عذاب مول لیتا ہے۔ ان شاء اللہ! میرا بیٹا ضرور کامیاب ہوگا۔ وقت پَر لگا کے اُڑ رہا تھا۔ اب بھی وہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتا رہا۔ اس دن اس نے اماں کی ہر نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔ آج صف اوّل کے ڈاکٹروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ اس نے ایک اسپتال ان مریضوں کے لیے بھی بنوایا تھا جو ضرورت مند اور مہنگے علاج کرنے سے قاصر تھے۔ مریضوں سے ان کا حال دریافت کرنا اور بدلے میں ان کی دعائیں لینا اس کا معمول کا کام تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق جب وہ پانچ نمبر بیڈ کے مریض کے پاس گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے اس کا کلاس فیلو عامر پڑا تھا جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ عامر بھی اس کو شرمندہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے معاف کر دو دوست...... میرا کوئی پرسان حال نہیں...... نوبت فاقوں تک آ پہنچی...... دوستوں کی بُری صحبت نے نشے پہ لگا دیا۔

ایک دن اچانک کسی بات پہ مشتعل ہو کر بات ہاتھا پائی کی نوبت تک جا پہنچی۔ مخالف ٹانگ میں گولی مار کر چلے گئے۔ ٹانگ میں زہر پھیل گیا۔ کسی ہمدرد نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ تم ہی اس کا علاج کر سکتے ہو۔ دوست میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دو۔''

''ان شاء اللہ ضرور!'' اور نرس کو آپریشن کی تیاری کا کہہ کر وہ نوافل ادا کرنے چلا گیا۔ آج وہ خود کو دراز قد محسوس کر رہا تھا۔ برسوں پہلے جس بونے زین کا مذاق اُڑا کر اس کو بے ہمت کر دیا گیا تھا، آج وہ اس بونے پن کے ساتھ لوگوں کی جانیں بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

مقصد

عائشہ خالد، راول پنڈی

وہ کچھ مطمئن دکھائی دے رہا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ روزے کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے دیگر اعمال کی وجہ سے بہت پریشان بھی تھا۔ کیوں کہ زندگی میں اس نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا تھا جس پر اسے جنت میں جانے کی اُمید ہوتی ماسوائے باقاعدگی سے روزے رکھنے کے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جب زین کو اس کا نامۂ اعمال پکڑایا گیا۔ جب اس نے کھول کر دیکھا تو اس میں زین کی کوئی بھی نیکی درج نہیں تھی، وہ حیران رہ گیا۔ وہ اسی سوچ میں مبتلا تھا کہ آخر اس کے رکھے گئے روزوں کا ثواب اسے کیوں نہیں ملا؟ اس کا انجام کیا ہوگا کہ اتنے میں ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''زین! افسوس تم نے روزے تو رکھے مگر اس کے اصل مقصد سے نا آشنا رہے۔ تمہارے دیگر اعمال بھی تمہیں جنت میں پہنچا نہیں سکتے۔''

زین نے کہا۔ ''میں نے اسی طرح روزے رکھے جیسے مجھے بتایا گیا۔ میں نے صبح سے شام تک بالکل بھوکا پیاسا رہ کر روزے رکھے۔'' وہ حیران تھا۔

پھر آواز آئی۔ ''روزے کا مقصد محض بھوکا پیاسا رہنا نہیں۔ اپنے آپ کو تمام بُرائیوں سے روکے رکھنا بھی روزے کا مقصد ہے مگر تم روزے کے ساتھ لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، جھوٹ اور غیبت سے منع نہ ہوئے۔ نہ نمازیں پڑھیں، نہ ہی قرآن۔ تمہارے دل میں غریبوں کی مدد کا احساس پیدا نہ ہوا بلکہ تمہیں تو غریب کی صورت نہ بھاتے تھے۔''

اب تو زین کو اپنا انجام بُرا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک بار پھر آواز آئی۔ ''اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمہیں جہنم میں ڈالا جاتا ہے۔'' زین چیخنے لگا۔ ''مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو۔'' اتنے میں زین کی آنکھ کھلی اور وہ حیران رہ گیا کہ یہ سب اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ خواب میں ہی وہ روزے کے حقیقی مقصد سے آشنا ہو گیا تھا۔ اب وہ عملی عبادات اور حقوق اللہ اور حقوق العباد پر پوری توجہ دیتا۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

☆☆☆

قائداعظمؒ محمد علی جناح لندن سے بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے آئے اور انہوں نے عملی زندگی کا آغاز بمبئی میں وکیل کی حیثیت سے کیا۔ اس وقت کسی نئے وکیل کو مقدمہ ملنا مشکل تھا۔ قائداعظمؒ روزانہ صبح عدالتی کارروائی دیکھنے جاتے اور شام کو اپنے دفتر میں مؤکل (وہ شخص جو وکیل مقرر کرے) کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ وہ لوگ جو کمیشن پر مقدمات لاتے تھے، انہوں نے قائداعظمؒ محمد علی جناح پر زور دیا کہ وہ بھی کمیشن دینے کی حامی بھریں تو وہ مقدمات لا سکتے ہیں۔ قائداعظمؒ کو اللہ کی ذات اور اپنی محنت پر مکمل یقین تھا، اس لیے انہوں نے اسے پسند نہیں کیا اور پھر ان کے پاس کچھ عرصے بعد مقدمات کی کمی نہ رہی۔ قائداعظمؒ ہمیشہ اس مقدمے کو لیتے تھے جو حق پر ہوتا تھا۔ انہوں نے کسی جھوٹے اور بے ایمان کا مقدمہ نہیں لیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ ان کی عظمت کو واضح کرتا نظر آتا ہے۔ ایک بار ایک مؤکل اپنے ہارے ہوئے مقدمے کی فائل اس غرض سے ان کے پاس لایا کہ مجھے اعلیٰ عدالت میں اپیل کے لیے جانا ہے، مگر اس سے قبل میں یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ آیا مجھے اس میں کامیابی ہوگی یا نہیں۔ آپ میری فائل پڑھ کر یہ رائے دے دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

قائداعظمؒ نے فائل لینے سے پہلے اپنی فیس گھنٹے کے حساب سے بتائی اور اندازہ لگا کر بتایا کہ اتنی رقم میرے سیکریٹری کے پاس جمع کرا دو۔ مؤکل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''جناب! میرے پاس رقم کم ہے۔''

قائداعظمؒ نے معذرت کر لی۔ اسی لمحے مؤکل کو ایک خیال سوجھا۔ اس نے کہا۔ ''جناب آپ یہ رقم رکھ لیں اور وہیں تک فائل کا مطالعہ کر کے رائے لکھ دیں، جہاں تک یہ رقم ختم ہو جائے۔''

قائداعظمؒ مان گئے۔ مقررہ دن وہ مؤکل فائل اور رائے لینے واپس آیا تو قائداعظمؒ نے کہا۔ ''میں نے تمہاری فائل مکمل دیکھ لی ہے اور رائے بھی تحریر کر دی ہے۔'' مؤکل بے حد خوش ہوا اور فائل لے کر واپس جانے لگا تو قائداعظمؒ نے مزید کہا۔ ''اور ہاں تمہاری دی ہوئی رقم بچ گئی ہے، وہ بھی لیتے جانا۔ مجھے فائل پڑھنے میں بہت کم وقت لگا۔''

یہ تھی قائداعظمؒ محمد علی جناح کی دیانت داری۔

قائداعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عام کارکن کی بھی بے حد عزت کرتے تھے۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے چندے کا اعلان کیا تو ملک کے گوشے گوشے سے چندہ آنے لگا۔ وہ چندہ قائداعظمؒ اتنی مصروفیت کے باوجود خود وصول کر کے رسید دیتے تھے۔

مختار مسعود لکھتے ہیں۔ قائداعظمؒ بہت کم کھانا کھاتے تھے۔ دبلے، پتلے، بوڑھے اور بیمار تھے۔ جسمانی کمزوری بہت بڑھ چکی تھی۔ زیارت میں قیام کے دوران ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپورتھلہ برادرز کے نام

سے مشہور ہیں، انہیں زیارت بھیجا جائے کیوں کہ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا قائداعظمؒ کو بے حد پسند ہے۔ کپورتھلہ باورچی بھائیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ لاہور چھوڑ کر فیصل آباد چلے گئے تھے۔ وہاں سے زیارت پہنچے اور کھانا پکایا۔ اس روز قائداعظمؒ نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے سیکریٹری فرخ امین کو بلایا اور کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی تو وہ ناخوش ہوئے۔ اپنی چیک بک منگوائی۔ باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا اور اس رقم کا چیک کاٹ کر رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی۔ باورچی کو روانہ کیا اور کہا۔ ''یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا سرکاری خرچ پر فراہم کرے۔''

آزادی کے فوراً بعد حکومتِ پاکستان نے گورنر جنرل کے ذاتی استعمال کے لیے ایک طیارے کا آرڈر دیا۔ طیارہ ساز کمپنی نے اس میں کچھ اضافی لوازمات تجویز کیے۔ قائداعظمؒ نے بحیثیت گورنر جنرل ان اضافی اخراجات کی منظوری دے دی۔ جب طیارہ بنانے والی کمپنی نے جہاز کے بل کے ساتھ اضافی اخراجات کی رقم کو وزارت خزانہ کے پاس منظوری کے لیے بھیجا تو وہاں پر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد نے یہ نوٹ بھی لکھا کہ ان اضافی اخراجات کے لیے پہلے وزارتِ خزانہ سے اجازت لینی چاہیے، دوسرے پاکستان کے پاس کم رقم ہے جس سے حکومتی امور کو چلانا مشکل ہو رہا ہے۔ تاہم پھر بھی قوم کے باپ (Father of the Nation) کے لیے محکمہ کسی نہ کسی طرح بندوبست کر ہی لے گا۔

جب یہ نوٹ لگی ہوئی فائل دوبارہ قائداعظمؒ محمد علی جناح کے پاس آئی تو وہ مسکرائے۔ انہوں نے اپنے ماتحت وزارتِ خزانہ کو نہ تو وہ نوٹ واپس لینے کا حکم دیا اور نہ ہی کوئی اور کارروائی کی۔ انہوں نے اصول پسندی اور اعلیٰ ظرفی کا شان دار مظاہرہ کرتے ہوئے فائل پر لکھا۔ ''یہ ایک غلطی تھی کہ کمپنی کو اضافی لوازمات کی اجازت دینے سے پہلے وزارتِ خزانہ کی منظوری نہیں لی گئی۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ موجودہ حالات میں ہم ان اضافی اشیاء کے بغیر بھی گزارا کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان اضافی چیزوں کا آرڈر منسوخ کر دیا جائے۔''

قائداعظمؒ کے اے ڈی سی، عطا ربانی لکھتے ہیں: ''قیامِ پاکستان کے بعد تین اہم شخصیات گورنر جنرل کی مہمان بنیں۔ ان میں سے ایک برطانیہ کے بادشاہ جارج ششم کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر اور ان کی اہلیہ تھیں۔ ان کی آمد سے پہلے پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر نے گورنر جنرل قائداعظمؒ محمد علی جناح سے ملاقات کی اور یہ تجویز دی کہ اگر انگلستان کے بادشاہ کے بھائی کی آمد پر گورنر جنرل خود ائیرپورٹ جا کر انہیں وصول کریں تو یہ خیرسگالی کی علامت ہوگی۔

قائداعظمؒ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ میں حکومتِ برطانیہ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ اگر میرا بھائی برطانیہ گیا تو پھر بادشاہ کو بھی استقبال کے لیے لندن ائیرپورٹ پر جانے کی زحمت اُٹھانا پڑے گی۔ برطانوی ہائی کمشنر لاجواب ہو کر خاموش ہوگیا۔''

قائداعظمؒ صحیح معنوں میں اسلامیانِ ہند کے ''قائداعظمؒ'' بننے کے قابل تھے۔ ایک ایسی پس ماندہ قوم کے قائداعظمؒ جو خودشناسی اور خوداعتمادی کے جوہر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس قائدؒ نے ہمیں غلامی کی تاریکیوں سے نکال کر آزادی کی روشنی اور کامرانیوں سے ہم کنار کیا تا کہ ہم اپنے آپ کو پہچان سکیں، اپنی قومی شخصیت سے واقف ہو سکیں لیکن افسوس کہ پاکستان کی نئی نسل قائداعظمؒ تو کیا، خود پاکستان سے واقف نہیں ہے۔ Verdict of India کے مصنف بیورلے نکلس نے 1964ء میں کہا تھا: ''میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اُٹھایا تھا اور ایک دُنیا میری مخالف ہوگئی لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اس کی صداقت پر مجھے اس لیے یقین تھا کہ میں مسٹر جناحؒ سے واقف نہیں۔'' اور جناحؒ کون تھے؟ آغا خان مرحوم کی زبانی سنیئے ''مجھے اپنی زندگی میں بے شمار سیاست دانوں سے سابقہ پڑا مثلاً لائڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی اور مہاتما گاندھی لیکن جناحؒ، ان سب میں منفرد تھے۔ میرے خیال میں ان سے کوئی بھی جناحؒ سے زیادہ مضبوط سیرت و کردار کا مالک نہیں تھا۔ ہوش، تدبر اور عزیمت و استقامت جو سیاست کے سنگِ بنیاد ہیں، جناحؒ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔'' اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے قائداعظمؒ کے متعلق کہا تھا۔ ''شہنشاہ اورنگزیب عالم گیر کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانی میں تبدیل کر دیا۔'' قائداعظمؒ زندہ باد!

☆☆☆

ننھے قارئین

بوجھو تو جانیں

1- دھوپ کبھی نہ اسے سکھائے
سوکھا جب وہ سائے میں آئے

2- خشکی پر نہ اس کو پاؤ
پانی میں اترو تو کھاؤ

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

3- موتی ہیں انمول
مل جائیں بن مول

4- ایک قلعہ اندر سے گورا
جیسے دودھ کا کٹورا

(اسامہ ظفر راجہ، مری)

5- کرنے آئے من کی بات
جو بھی دیکھے مارے ہاتھ

6- نیلی چادر پیلے پھول
ان پر مٹی ہے نہ دھول

(مہک خالد شیخ، لاہور)

7- منہ کو کھولے بڑھتی ہے
ہر چیز کے ٹکڑے کرتی ہے
ایسی ہے ایک مانو!
جو ہر جگہ پہ ملتی ہے

(عائشہ خالد شیخ، لاہور)

8- جب کریں منہ اس کا کالا
کام بنائے سب سے اعلیٰ

9- بیٹھے بیٹھے تڑ تڑ بولا
بن کر اٹھا آگ بگولا

(محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

جوابات: 1- پسینہ 2- غوطہ 3- آنسو 4- ناریل 5- مچھر 6- تارے 7- قینچی 8- قلم 9- پٹاخہ

پہلے مچھلی کی یہ تصویر کسی موٹے کاغذ پر اُتار لیجیے۔ پھر قینچی سے اسے چاروں طرف سے کاٹ لیجیے۔ مچھلی کی دُم سے پیٹ تک موٹی لائنوں کے درمیان جو جگہ ہے، اسے بھی کاٹیے۔ اس کے بعد ٹب یا کسی بڑے برتن میں پانی بھریے اور مچھلی کو اس میں چھوڑ دیجیے۔ اب مچھلی کے پیٹ میں جو گول سوراخ ہے، اس میں تیل کا قطرہ ٹپکائیے۔ مچھلی ناچنے لگے گی۔

یعقوب بن اسحاق کندی

یعقوب بن اسحاق کندی کا پورا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح کندی ہے۔ یعقوب کندی کے والد کوفہ میں حاکم تھے لیکن ہارون الرشید نے ان کے والد کا تبادلہ بصرے میں کر دیا، چناں چہ یعقوب کندی 800ء میں بصرے میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ جب آپ جوان ہوئے تو آپ نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور پھر ساری زندگی یہیں گزار دی۔ آپ بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ آپ نے علمِ طب میں بھی بہت کمالات دکھائے۔

یعقوب کندی کے باپ دادا شاہی دربار سے منسلک تھے اور ان کا شمار امراء میں ہوتا تھا لیکن یعقوب کندی، علم و ادب کے دلدادہ تھے اور تصنیف و تالیف میں دربار سے منسلک رہے۔ ایک دفعہ خلیفہ وقت متوکل جو شکی مزاج حکمران تھا کسی کے کہنے پر یعقوب کندی کے خلاف ہوگیا۔ چناں چہ متوکل نے یعقوب کندی کو دربار سے نکال دیا اور ان کا ساز و سامان جس میں علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، ضبط کر لیا۔ بعد میں سند بن علی کی سفارش پر آپ کو کتابیں واپس مل گئیں، لیکن دربار سے آپ کا تعلق قائم نہ ہو سکا اور آپ نے زندگی کا باقی حصہ ایک گوشے میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کے کام میں بسر کیا۔

مامون الرشید کے خلافت کا زمانہ تھا، سائنس اور فلسفہ کے ہر جگہ چرچے رہتے تھے۔ ان دنوں بلخ کے ایک عالم کو یعقوب کندی سے عداوت ہوگئی اور وہ آپ کا جانی دشمن بن گیا، یہاں تک کہ اس نے آپ کو جان سے مار دینے کا منصوبہ بنایا۔ بعض ذرائع سے آپ کو اس منصوبے کا علم ہوگیا۔ اگر آپ چاہتے تو اس عالم شخص کو گرفتار کرا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، آپ نے اسے گھر بلایا اس کے ساتھ بحث مباحثہ کیا اور اسے دلائل دے کر سمجھایا کہ سائنس اور فلسفہ، اسلام کے مخالف نہیں ہیں۔ اس چیز کا عالم شخص پر اتنا اچھا اثر پڑا کہ وہ کچھ عرصہ تک یعقوب کندی کے حلقہ درس میں شامل رہا اور سائنس اور فلسفے کے بارے میں اس کے تمام شکوک جاتے رہے۔ یعقوب کندی بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ انہوں نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، ہیئت (فلکیات) موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر تحقیقات کیں اور اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھیں۔ آپ نے نہ صرف یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، بلکہ ان پر شرحیں بھی لکھیں، اس طرح ان کے مشکل مسائل کو آسان بنا دیا۔ یورپ کے علماء نے آپ کا شمار عالمِ اسلام کے بلند پایہ سائنس دانوں میں کیا ہے۔

یعقوب کندی نے ریاضی کی چار کتابیں تصنیف کیں، یعقوب کندی سے پہلے کیمیا دان اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک کم قیمت دھات کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بات کی تردید کی اور اسے باطل علم قرار دیا۔ آپ کا قول تھا کہ کسی کیمیائی تبدیلی سے پارے یا تانبے کو سونے میں نہیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں میں یعقوب کندی پہلے شخص ہیں جنہوں نے موسیقی پر سائنٹیفک نظر ڈالی، یعقوب کندی کا کمال یہ ہے کہ اس نے نہ صرف موسیقی کے سُروں کی تکرار معلوم کرنے کا طریقہ ایجاد کیا بلکہ اس طریقے کو عمل میں لا کر ہر سُر کی تکرار معلوم کی اور اس کا درجہ مقرر کیا۔ طبیعیات میں بھی یعقوب کندی نے تحقیقات کا کام سرانجام دیا۔

بچو! طب میں یعقوب کندی کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ آپ کے زمانے میں جتنی مفرد دوائیں استعمال ہوتی تھیں، آپ نے ہر دوا کی خوراک کے لئے صحیح صحیح مقدار مقرر کی۔ اس مسئلہ پر اطباء میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا اور نسخہ نویسی کے وقت بڑی مشکل پیش آتی تھی، چناں چہ جب یعقوب کندی نے اپنی تحقیقات کو کتاب کی صورت میں پیش کیا تو طبیبوں کی مشکل دُور ہوگئی۔ اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ 1531ء میں اس ترجمہ کو جرمنی میں شائع کیا گیا۔

آپ نے اپنی زندگی میں نو خلفائے عباسی کا زمانہ دیکھا۔ آپ 873ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اُمید ہے کہ خیر و عافیت سے ہوں گی۔ آپ اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم اگلا شمارہ تیار کرنے میں جوش و خروش سے مشغول ہو گی۔ پچھلے ماہ میرے خط کی پسندیدگی اور حوصلہ افزائی کرنے کا بہت شکریہ! اس ماہ بھی کچھ تحاریر بھیج رہی ہوں، ضرور شائع کیجیے بشرطیکہ معیاری ہوں۔ اس مرتبہ رسالہ 28 تاریخ کو ہی مل گیا۔ اتنی خوشی ہوئی جتنی کہ...... جتنی کہ سکندرِ اعظم کو نیا ملک فتح کرتے ہوئے بھی نہ ہوتی ہو گی۔ سرورق کو دیکھ کر ہی ہنسی آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح اداریہ بھی بہت اچھا لگا۔ نئی کہانی ''ٹھگ'' بھی بہت مزے کی ہے۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر چچا بھلکڑ شادی میں گئے، کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر اور گھابرو بہت اچھی لگیں۔ دُنیا کا مقبول کھیل سائیکلنگ اور ڈاکٹر ایڈورڈ جینر کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تعلیم و تربیت کو بہترین رسالہ کی کیٹگری میں دوم انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ شاعرِ مشرق کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا کیوں کہ علامہ اقبالؒ بھی ہماری پسندیدہ شخصیات میں سے ایک ہیں۔ محاورہ کہانی کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ پچھلے ہفتے میرے امتحانات ختم ہو گئے ہیں، اس وجہ سے خط تفصیل سے لکھا۔ اُمید ہے یہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔ اب اجازت چاہیے۔ فی امان اللہ! (بی بی ہاجرہ، ہری پور)

☆ خط لکھنے کا بہت شکریہ، تحریریں بھی ضرور شائع کریں گے۔

تعلیم و تربیت کو ہر ماہ خوب صورت مضامین سے آراستہ کر کے آپ نونہالوں کی گراں قدر تربیت کا جو فریضہ انجام دے رہے ہیں اور جس خلوص سے کر رہے ہیں، اس کے لیے آپ اور رسالہ کے لیے دعائیں اور ہدیہ تہنیت پیش ہے۔ ایڈیٹر کی ڈاک پڑھ کر گزشتہ ماہ کے تعلیم و تربیت پر رواں تبصرہ خوب ہوتا ہے۔ مسکرایئے میں لطیفے معیاری ہوتے ہیں مگر ایک آدھ لطیفہ سنا سنایا لگتا ہے، اس لیے صرف نئے اور معیاری لطائف شائع کیے جائیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں ماہرِ فلکیات انڈرس سلیسس کے بارے میں معلومات بیش بہا تھیں۔ دارچینی پر مضمون معلومات افزا تھا۔ میری بیاض سے اور مختصر مختصر سلسلے تعلیم و تربیت کی جان ہیں۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کہانیوں کا سلسلہ آپ بھی لکھئے پسند آیا۔ غرضیکہ تعلیم و تربیت کو خوب پایا۔ آخر میں آپ اور رسالہ کے لیے دعا ہے۔

تم جیو ہزار برس، ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار
آپ کی تعلیم و تربیت کا ایک پھول! (علینہ احمد، راول پنڈی)

☆ تعریف اور حوصلہ افزائی کا شکریہ!

اکتوبر کا شمارہ ملا۔ جہاں دیدہ زیب سرورق اور دل کش طرز نے دل لبھایا، وہیں بامقصد اور سبق آموز کہانیوں نے بھی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا۔ تعلیم و تربیت حقیقتاً نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کا کٹھن فریضہ بخوبی سرانجام دے رہا ہے۔ کہانیوں میں ٹھگ نے اگلی قسط کے لیے متجسس کیا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام تو پورے شمارے میں انتخاب ہوتے ہیں اور ہر ایک نئے انداز سے ایک نیا سبق سکھاتے ہیں۔ ہونہار مصور پر نظر ڈالی تو دل نے بے اختیار جج حضرات کی منصفی کو داد دی۔ ہر تصویر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ کچھ سادہ ہو کر بھی رنگا رنگ تصویروں سے اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ الغرض سارا شمارہ ہی ایک بہترین کاوش کا عملی نمونہ تھا۔

؎ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(فرحان خورشید، ریحان خورشید، کلورکوٹ)

☆ آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اپنی تحاریر کے ساتھ شریک ہوں۔

نومبر کا شمارہ اور تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام اچھے رہے۔ میں اس رسالے کا بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ کچھ ماہ ہی ہوئے ہیں مجھے اس رسالے کو پڑھتے ہوئے۔ مجھے میری دوست نے بتایا کہ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی اسے پڑھ لوں، اتنی تعریفیں جو سنی ہیں۔ جب پہلی مرتبہ میں نے اس کو پڑھا تو مجھے بہت مزہ آیا۔ اب تو ہر ماہ اس کا انتظار رہتا ہے۔ پلیز! میرا خط

ضرور شائع کیجئے گا۔ اسے ردی کی ٹوکری سے دُور رکھئے گا۔ میرے امتحانات قریب ہیں اور امتحانات کی تیاری میں لگی ہوئی ہوں، میرے لیے دعا کیجئے گا۔ (عائشہ مریم، میانوالی)

☆ آپ کا سجا سجایا، رنگین خط بہت پیارا لگا۔ ڈیئر بہت شکریہ!

کیسی ہیں آپ؟ ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی تحریریں کافی اچھی تھیں۔ ہر تحریر شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہی تھی۔ ٹھگ، حمد و نعت، دریائے راوی تو بہت ہی اچھے تھے لیکن میری تحریریں شائع نہیں ہوئیں؟ محنت تو میں نے بہت کی تھی اور اُمید بھی...... اگر آپ میرا خط شائع کریں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ہمیشہ چمکتا رکھے۔ آمین! (فاطمہ صدیقی، کندیاں)

☆ پیارا سا خط لکھنے کا شکریہ! تحریروں کے لیے فون پر رابطہ کیجئے۔

آپی جان! شمارہ دیکھ کر تو ہم خوشی سے جھوم جھوم گئے۔ اتنی جلدی جو مل گیا تھا۔ کرو مہربانی تم اہل زمیں پر یہ کہانی تو ہمارے دل کو چھو گئی۔ ''ٹھگ'' کہانی کے تو کیا ہی کہنے اتنی ذہانت...... اُف! اُف! ''محنت سے ہے عزت'' زبردست کہانی تھی۔ نیکی یا بیگار اور جرم اچھی کہانیاں تھیں۔ چچا بھلکڑ شادی میں گئے پڑھ کر تو لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ غرض پورا شمارہ بہترین تھا۔ یہ آپ لوگوں کی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے کہ تعلیم و تربیت نے دوئم انعام حاصل کیا۔ اُمید ہے آپ میرا خط ضرور شائع کریں گی۔ اللہ حافظ! (مریم عبدالسلام شیخ، نواب شاہ)

☆ دعاؤں کا شکریہ! تحریروں اور تجاویز کے ساتھ شرکت کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی، ڈیئر!

میں تقریباً ڈیڑھ سال سے یہ رسالہ پڑھ رہا ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں۔ نومبر کا رسالہ زبردست تھا۔ نیا ناول ٹھگ اچھا چل رہا ہے۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ چچا بھلکڑ سب سے اچھی تھی۔ میری ایک گزارش ہے کہ ہر شمارے میں کسی شہید کے بارے میں دیا کریں تاکہ ان کی روحوں کو سکون پہنچے اور کوئی نصیحت بھی کر دیں۔ آخر میں یہ شعر:

سورج کی طرح روشنی دیتا رہے گا تعلیم و تربیت
پھول کی طرح مہکتا رہے گا تعلیم و تربیت

(حذیفہ شہید، سیال کوٹ)

☆ ڈیئر حذیفہ! زندگی میں کام یابی کے لیے سخت محنت کیجئے، کیوں کہ محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

سب سے پہلے تو آپ کا اور آپ کی پوری ٹیم کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی شب و روز کی محنت کی بدولت اس بار ماہنامہ تعلیم و تربیت بہت مناسب وقت پر مارکیٹ میں دستیاب ہوگیا تھا۔ گزشتہ عرصہ کے برعکس اپنے قاریوں کو جلد مل گیا ہے اور اس بار بھی ہمیشہ کی طرح اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بہت ہی پیاری باتیں اور بہت معلوماتی تحریروں کے ساتھ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ادارے کو اور ادارے سے وابستہ ہر ایک کو خوش و خرم رکھے اور مزید ترقیوں سے نوازے۔ آمین! (عمران خان غوری، بہاول پور)

☆ آپ کے خط شکریہ! آپ کی مستقل شرکت ہمارے لیے باعث خوشی ہے۔

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلام۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی سرورق چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ تمام کہانیاں پھولوں کی طرح مہک رہی تھیں۔ چچا بھلکڑ نے رسالے کو چار چاند لگائے، چچا بھلکڑ کی کہانی نے رسالے کو دوبالا کر دیا۔ ہم اپنی امی جان سے چچا بھلکڑ کی کہانیاں سنتے ہیں۔ پلیز! یہ سلسلہ جاری رکھئے گا۔ ''تعلیم و تربیت'' بہت عمدہ اور دل فریب رسالہ ہے۔ یہ سب آپ کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے۔ ماہنامہ تعلیم و تربیت کو ''بہترین رسالہ'' کی کیٹگری میں دوم انعام پر میں دل و روح کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتی ہوں۔ خدا تعلیم و تربیت کو زندگی بھر کام یابیوں سے ہم کنار کرے۔ آمین! (حفصہ اعجاز، صوابی)

☆ پیاری حفصہ اتنی محبت کا شکریہ۔ آپ کے لیے بہت سی دُعائیں۔

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

تہنیت آفرین، منڈی بہاؤالدین۔ غلام مرتضیٰ علوی، گوجرہ۔ ماہ نور نبیل، رینالہ خورد۔ حافظ خنساء اقبال، جہانیاں۔ تحریم نور طاہر۔ ثوبیہ امان، وہوا۔ کشف مریم، لاہور۔ محمد حاشر، چارسدہ۔ مریم فاطمہ، طیبہ وحید، منڈی بہاؤ الدین۔ عائشہ حیاء، عبدالسلام شیخ، نواب شاہ۔ سید انیس احمد، لاہور۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ عتیق الرحمان، ڈیرہ غازی خان۔ سمیرا زاہد، بھکر۔ منیبہ افضل مغل، گوجرانوالہ۔ نشاء اعجاز، جوہر آباد۔ لاریب دلدار، چکوال۔ فریدہ گوہر، ملتان۔ امامہ شبیر، فیصل آباد۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ معتصم الٰہی، شیخوپورہ۔ حافظ ام حبیبہ۔ محمد جعفر، خوشاب۔ محمد حسن محمود، لاہور۔ محمد شاہ ویز اکرم یوسف زئی۔ خدیجہ تحریم، رینالہ خورد۔ فائزہ وحید، بھیرووال۔ عبدالرحیم، پیرمحل۔ محمد مبشر، کوہاٹ۔ وجیہا کاکاخیل، پشاور۔ حمیرا ریاست، واہ کینٹ۔ محمد حامد رضا المصطفیٰ، چنیوٹ۔ محمد سفیان شاہین، لودھراں۔ اسماء انور، لاہور۔ آمنہ یوسف، لاہور۔ محمد حبیب اللہ بابر، میانوالی۔ خدیجہ خرم، لاہور۔ غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ۔

لعلِ بدخشاں

قندِ مکرر

سعید لخت

پُرانے زمانے کی بات ہے، جنوبی ہندوستان کی ایک ریاست پر ایک بہت طاقت ور اور بہت دولت مند بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے خزانے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے اور فوج اتنی مضبوط تھی کہ اس کے خیال ہی سے دشمن تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

ایک دن بادشاہ کے دارالسلطنت میں ایک غریب پردیسی قسمت آزمانے آیا۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی نہ پیر میں جوتا۔ تن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے اور یوں گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا جیسے مدتوں کا بھوکا ہو۔ بجھی بجھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ شاید اللہ کے کسی بندے کو ترس آ جائے اور وہ اسے کھانے کو کچھ دے دے۔ گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹھوکر لگی اور دھم سے زمین پر گر پڑا۔ سنبھل کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پاس ہی دھول میں لال لال سی کوئی چیز چمکتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھا لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پتھر تھا جس میں سے سرخ شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ہیرے جواہرات کا نام تو سنا تھا، لیکن دیکھے کبھی خواب میں بھی نہ تھے۔ سوچنے لگا، آس پاس کوئی بھٹیارا ہو تو اسے یہ پتھر دکھاؤں۔ شاید وہ اس کے بدلے ایک آدھ روٹی دے دے۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے اُٹھا اور کمر سیدھی کر کے اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے ایک پنواڑی کی دُکان نظر آئی۔ سوچا، اس پنواڑی سے کسی بھٹیارے کا پتا پوچھوں۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا پنواڑی کے پاس گیا اور سلام کر کے بولا۔ ”کیوں میاں، یہاں قریب میں کوئی بھٹیار خانہ ہوگا؟“

پنواڑی بولا۔ ”بائیں طرف گلی میں مُڑ جاؤ۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک سرائے ہے۔ وہاں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔“

پردیسی نے گلی کی طرف قدم بڑھایا، پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ پنواڑی کو یہ پتھر دکھاؤں۔ ہوسکتا ہے یہ اس کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس نے مٹھی کھولی اور چمکتا ہوا پتھر پنواڑی کو دکھا کر

بولا۔ ''کیوں میاں تم بتا سکتے ہو کہ یہ کیا چیز ہے؟''

پنواڑی نے پتھر کو غور سے دیکھا اور پھر بولا۔ ''مجھے تو یہ کوئی بہت ہی قیمتی چیز لگتی ہے۔ ایسا کرو، شاہی محل چلے جاؤ اور شاہی باورچی خانے کے داروغہ سے ملو۔ وہ بہت نیک دل اور غریب پرور انسان ہے۔ اُمید ہے وہ تمہاری مدد کرے گا مگر ذرا ٹھہرو۔ تمہاری شکل پر تو ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ لو، یہ پان کھاتے جاؤ۔ اس سے منہ پر رونق آ جائے گی۔''

پنواڑی نے پان کی گلوری بنائی، اس میں الائچی اور زعفران ڈالا اور چاندی کا ورق لگا کر پردیسی کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ پان چباتا ہوا شاہی محل کے دروازے پر پہنچا اور شاہی باورچی خانے کے داروغہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ دربانوں نے اسے داروغہ کے پاس پہنچا دیا۔

داروغہ نے اسے پان چباتے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور بولا۔ ''تن پہ نہیں لتا، پان کھائیں البتہ۔ ارے احمق! پہلے کپڑے لتے کا بندوبست کرتا، پیٹ میں روٹی ڈالتا، پھر پان کھاتا تو اچھا بھی لگتا۔ اچھا بتا، کون سی مصیبت تجھے میرے پاس کھینچ لائی ہے؟''

پردیسی نے ڈرتے ڈرتے پتھر دکھایا اور کہنے لگا۔ ''جناب، یہ پتھر مجھے راستے میں پڑا ملا تھا۔ تین دن سے بھوکا ہوں۔ اگر یہ کسی کام کا ہو تو آپ لے لیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا مجھے دے دیں۔''

داروغہ پتھر دیکھ کر بولا۔ ''اے پردیسی، خوش ہو جا کہ قسمت تجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔ خوش حالی کے دروازے عنقریب تجھ پر کھلنے والے ہیں۔ تیرے سارے دلدّر ایک دم دُور ہو جائیں گے۔ آج کی رات تو میرے پاس رہ۔ کل صبح تجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ وہی تجھے اس کی صحیح قیمت دے سکتے ہیں۔''

دوسرے دن صبح کو پردیسی نے نہا دھو کر داروغہ کے دیئے ہوئے کپڑے پہنے اور ناشتا کر کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔

بادشاہ کے خزانوں میں دُنیا جہان کے بیش قیمت ہیرے جواہرات، لعل اور موتی بھرے پڑے تھے، لیکن ایسا خوب صورت اور ان مول لعل اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ یہ افغانستان کے شہر بدخشاں کا لعل تھا۔ اس شہر کے لعل دُنیا بھر میں مشہور تھے اور بادشاہوں اور مال دار رئیسوں سے منہ مانگی قیمت پاتے تھے۔

بادشاہ کچھ دیر گم صم لعل کو دیکھتا رہا، جس کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں، پھر تین دفعہ تالی بجا کر بولا۔ ''کوئی ہے؟'' پلک جھپکتے میں ایک حبشی غلام پردے کے پیچھے سے نکلا اور ہاتھ باندھے، گردن جھکائے بادشاہ کے روبہ رو کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے غلام کو حکم دیا۔ ''خزانچی سے کہو، اشرفیوں کا ایک توڑا لے کر فوراً مابدولت کی خدمت میں حاضر ہو'' غلام نے جھک کر تین فرشی سلام کیے اور اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد خزانچی سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی لے کر حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے ایک طرف ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے تھیلی پردیسی کی طرف پھینکی اور بولا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو اور یہ لعل تمہیں جہاں کہیں سے بھی ملا ہو، ہم اس کے بدلے تمہیں ایک ہزار اشرفیاں دیتے ہیں۔ تھیلی اُٹھا لو۔'' پردیسی کی بوٹی بوٹی خوشی سے پھڑکنے لگی۔

اس نے جلدی سے تھیلی اُٹھائی اور بادشاہ کو سلام کرتا ہوا، اُلٹے قدموں دربار سے نکل گیا۔ بادشاہ نے لعل بدخشاں خزانچی کو دیا اور حکم دیا کہ اسے سونے کی ڈبیا میں بند کر کے خزانے میں رکھ دے۔

اس واقعے کو چند روز گزرے تھے کہ بادشاہ کو اس لعل کا خیال آیا جو اس نے پردیسی سے خریدا تھا۔ وہ خزانے میں گیا اور ڈبیا کھولی تو اس میں سے، لعل کے بجائے، ایک لمبا تڑنگا خوب صورت نوجوان نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ وہ کبھی ڈبیا کو دیکھتا اور کبھی اس اجنبی نوجوان کو جو اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جب اس کے اوسان ذرا بجا ہوئے تو بولا۔ ''تم...... تم کون ہو؟ اور وہ لعل کہاں گیا جو اس ڈبیا میں بند تھا؟''

''میں ہی وہ لعل ہوں حضور والا۔'' نوجوان ادب سے بولا۔ آپ مجھ سے جو خدمت لینا چاہیں، لے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

بادشاہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''خیر، خیر، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ تم ایک بہادر اور نڈر نوجوان لگتے ہو۔ کیا تم ہمارے خاص فوجی دستے میں ملازم ہونا پسند کرو گے؟''

''بسر وچشم!'' نوجوان نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر اور گردن

جھکا کر کہا۔ ''میں حضور کی ہر خدمت بہ خوشی بجا لاؤں گا۔''

ان دنوں دارالسلطنت سے کچھ دُور، ایک گھنے جنگل میں، ایک بہت ظالم اور سنگ دل ڈاکو رہتا تھا۔ لوگ اسے رستم کہتے تھے اور وہ تھا بھی رستم ہی کی طرح طاقت ور اور شہ زور۔ جسم اتنا سخت اور ٹھکا ہوا کہ سوئی مارو تو ٹوٹے، اخروٹ مارو تو پھوٹے۔ پہلے پہل وہ دُور دراز کے گاؤں اور قصبوں میں ڈاکے ڈالتا تھا، پھر اتنا نڈر ہو گیا کہ بادشاہ کے شہر میں بھی گھس آتا اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتا۔ اب تک بادشاہ کے کئی نامی گرامی فوجی افسر اس ڈاکو کی تلوار کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور اس کا بال تک بیکا نہ ہوا تھا۔ بادشاہ ڈاکو کے ہاتھوں بہت تنگ تھا۔ اس نے چاروں کھونٹ ڈگی پٹوا دی تھی کہ جو بہادر جوان اس ڈاکو کو زندہ یا مردہ اس کے حضور پیش کرے گا، وہ اپنی اکلوتی شہزادی کی شادی اس کے ساتھ کر دے گا اور اس کی وفات کے بعد وہی اس کے تخت و تاج کا مالک ہو گا۔

''عالی جاہ کس سوچ میں پڑ گئے؟'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ! ہاں......'' بادشاہ خیالوں کی دُنیا سے واپس آ گیا۔ ''ہم سوچ رہے تھے کہ تمہیں کوئی ایسا کام بتایا جائے جو تمہاری شان کے مطابق ہو۔ سنو! ایک بدبخت ڈاکو نے ہمیں مدت سے پریشان کر رکھا ہے۔ وہ جتنا دلیر اور شجاع ہے، اتنا ہی چالاک اور عیار ہے۔ کیا تم اس ڈاکو سے لوہا لے سکتے ہو؟''

''میری بڑی خوش قسمتی ہو گی کہ میں حضور کی یہ خدمت بجا لا سکوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''حضور چند فوجی جوان میری کمان میں دے دیں۔ ان شاء اللہ تین دن کے اندر اندر اس کا سر حضور کے قدموں میں ہو گا۔''

دوسرے دن نوجوان جسم پر ہتھیار سجا، فوجی جوانوں کا ایک دستہ ساتھ لے، اس جنگل کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک غار میں اس ڈاکو کا ٹھکانہ تھا۔ جنگل بہت گھنا اور لمبا چوڑا تھا اور دن میں بھی وہاں رات کا سماں ہوتا تھا لیکن بہادر نوجوان دیوانہ وار اندر گھستا چلا گیا اور دوپہر ہونے تک غار کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ نوجوان کے آدھے سے زیادہ ساتھی میدان میں کھیت رہے لیکن نوجوان ڈٹا رہا اور اس نے شام ہونے سے پہلے پہلے تمام ڈاکوؤں کا صفایا کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار رستم زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ نوجوان اسے شہر لے آیا جہاں اسے ایک

اُونچے سے درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ بادشاہ نے وعدے کے مطابق شہزادی کی شادی نوجوان کے ساتھ کر دی اور اس خوشی میں ایک ہفتے تک پورے ملک میں جشن منایا گیا۔

شہزادی کی شادی کو ایک مہینا ہو گیا تھا اور اس عرصے میں اس نے نوجوان سے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں پوچھی تھی کیوں کہ اس نے شہزادی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس کے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائے لیکن شہزادی کے دل میں دھکڑ پکڑ ہوتی رہتی تھی۔ وہ یہ جاننے کو بے قرار تھی کہ اس کا شوہر کون ہے اور کس ملک کا باشندہ ہے۔

ایک دن دونوں میاں بیوی دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ شہزادی بولی۔ ''ہماری شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے، اب تو مجھے بتا دیجیے کہ آپ کون ہیں اور کس ملک کے رہنے والے ہیں۔''

یہ سن کر نوجوان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے متعلق کبھی کچھ نہ پوچھنا، ورنہ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دم دریا میں چھلانگ لگا دی۔ شہزادی چیختی چلاتی اس کے پیچھے دوڑی لیکن دریا کی تیز و تند لہریں اسے بہا کر خدا جانے کہاں لے گئیں۔ بادشاہ نے بڑے بڑے غوطہ خوروں کو بلوایا، دریا میں جال ڈلوائے لیکن نوجوان کو نہ ملنا تھا، نہ ملا۔

شہزادی نے چوڑیاں توڑ ڈالیں، سیاہ ماتمی لباس پہن لیا اور رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ بادشاہ نے اس کا دل بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔ شوہر کا غم اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا اور بادشاہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ کس طرح اپنی نورِ نظر کو موت کے منہ میں جانے سے بچائے!

ایک دن، سہ پہر کو شہزادی اپنے کمرے کے جھروکے میں بیٹھی باغ کا نظارہ کر رہی تھی کہ اس کی ایک کنیز، دل آرا، ادھر سے گزری۔ شہزادی کو دیکھ کر رُک گئی۔ پھر پاس آ کر بولی۔ ''بندی جان کی امان پائے تو کچھ عرض کرے۔''

''اجازت ہے۔ کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شہزادی نے کہا۔

''حضور!'' دل آرا بولی۔ ''کل آدھی رات کو میرے پیٹ میں درد اُٹھا۔ کسی کل چین نہ پڑا تو باہر نکل گئی کہ شاید چہل قدمی سے آرام آ جائے۔ اسی طرح ٹہلتی ٹہلتی، بے خیالی میں، دریا کے

کنارے چلی گئی۔ اچانک دریا کا کنارہ روشنی سے جگ مگا اُٹھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے اُڑن کھٹولے اُترے جن پر پری زاد سوار تھے۔ انہوں نے کنارے پر خوب صورت قالین بچھا دیئے۔ اس کے بعد اوپر سے ایک بڑا سا جھل مل کرتا سونے کا تخت اُترا جس پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر تاج تھا جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب سب پری زاد اپنی اپنی جگہ ادب سے بیٹھ گئے تو بوڑھے نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ سازندے ساز بجانے لگے اور گویے لہک لہک کر گانے لگے۔ پری زادوں کے بادشاہ کی دائیں جانب ایک نوجوان کھڑا تھا، کچھ بجھا بجھا سا، افسردہ سا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو منہ سے چیخ نکلتے نکلتے بچی۔ حضور! قسم سے، وہ بالکل آپ کے شوہر جیسا تھا۔''

شہزادی کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ اس نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اچھی دل آرا، آج رات تم مجھے وہاں لے چلو۔ ہو سکتا ہے آج بھی پری زادوں کا بادشاہ وہاں آئے۔''

دل آرا بولی۔ ''حضور، کل رات تو میں نہ جانے کس دھن میں اکیلی چلی گئی تھی۔ اب تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ کوئی مرد ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔''

شہزادی نے کہا۔ ''اری دل آرا، وہ تیرا شوہر اللہ مارا کہاں

ہے؟ کیوں نہ اسے ساتھ لے لیں؟''

جب آدھی رات ہوئی تو شہزادی چپکے سے اپنے کمرے سے نکلی۔ باہر باغیچے میں دل آرا اپنے شوہر کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تینوں محل کے خفیہ دروازے سے باہر نکل کر دریا کنارے پہنچے اور ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ ایک دم دریا کا کنارہ روشن ہو گیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو پچھلی رات ہوا تھا۔ جب سب پری زاد اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور بادشاہ نے سازندوں کو اشارہ کیا تو شہزادی درخت کی اوٹ سے نکل کر سازندوں کے پاس جا بیٹھی اور درد بھری آواز میں گانا

گانا ختم ہوا تو بادشاہ بولا۔ ''واہ وا! سبحان اللہ! لڑکی، تو نے ہمیں خوش کر دیا۔ مانگ، کیا مانگتی ہے؟''

شہزادی نے کہا۔ ''حضور، میرا شوہر مجھے واپس کر دیجیے۔ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

بادشاہ بولا۔ ''ہم پری زادوں کے بادشاہ ہیں اور یہ ہمارا بیٹا ہے۔ ایک دن ہم کسی بات پر اس سے ناراض ہو گئے اور اسے لعل بنا کر تمہارے شہر میں پھینک دیا۔ خیر، اب تمہیں اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی ہے۔ ہم تمہیں تمہارا شوہر واپس کرتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی تمام پری زاد غائب ہو گئے۔ شہزادی

شروع کر دیا۔ تمام پری زاد دم بخود اس کا گانا سنتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز نے ان پر جادو کر دیا ہے۔

شہزادے کو لے کر محل میں آئی، اور وہ محل جہاں پہلے ہر دم اداسی چھائی رہتی تھی، اب وہاں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ ☆☆

رانا محمد شاہد

صحرائے چولستان

لفظ ''چولستان'' ترکی لفظ ''چول'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں صحرا۔ یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ لفظ چولستان ایک عراقی لفظ ''چیلستان'' کی بگڑی شکل ہے جس کا مطلب ہے ''بے آب و گیاہ وادی۔'' چولستان کے نام کے حوالے سے کئی روایات مشہور ہیں۔ کچھ ماہرین کے نزدیک چولستان لفظ چولنا سے نکلا ہے۔ مقامی زبان میں اس کا مطلب چلنا یا حرکت دینا ہے۔ یہاں موجود ریت کے ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے چولستان نام رکھ دیا گیا ہو۔ یہاں کے مقامی لوگ اسے ''روہی'' کا نام بھی دیتے ہیں۔ مقامی زبان میں ''روہ'' پہاڑ کو کہا جاتا ہے۔ چولستان میں آپ جدھر بھی نظر دوڑائیں ریت کے ٹیلے پہاڑوں کا سا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ اسی مناسبت سے اسے ''روہی'' کا نام دیا گیا۔ مقامی روایات کے مطابق لفظ چولستان کا ماخذ ''چولی'' ہے۔ اس کی وجہ عموماً یہ بیان کی جاتی ہے کہ چولستان کی عورتیں چوں کہ گھاگھرے پر کسی ہوئی چولی پہنتی ہیں جو کہ شکل و شبہات کے لحاظ سے یہاں کے ٹیلوں سے ملتی جلتی ہے۔

مورخین کے مطابق کسی زمانے میں چولستان میں تقریباً 400 قلعے موجود تھے۔ ان قلعوں کی دیواریں جپسم اور گارے سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان قلعوں میں سب سے مشہور قلعہ، قلعہ ڈیراور ہے۔ یہ قلعہ صحرا کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس چوکور قلعہ میں 40 برج ہیں۔ اس قلعہ میں موجود سرنگ اپنے عروج کے زمانے میں دہلی تک جاتی تھی۔ قلعہ کی دیوار کے ساتھ ایک نالہ ہے۔ مورخین کے مطابق یہاں سے ایک دریا گزرتا تھا جو دریائے ستلج کی ایک شاخ تھی۔ چولستان میں جہاں آج ہمیں سنہری چمکتی ریت نظر آتی ہے، وہاں کسی زمانے میں سرسبز کھیت لہرایا کرتے تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں اس صحرا کے بیچوں بیچ دریائے ہاکڑہ گزرتا تھا۔ اس دریا کو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں دریائے سرسوتی کا نام دیا گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قدرتی آفات اور جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے دریا خشک ہوگیا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے زمین بنجر ہوتی گئی۔ دریا کے کناروں پر آباد قصبے ویران ہوتے گئے۔ یوں ایک پوری تہذیب خشک سالی کی نذر ہوگئی۔ ہرے بھرے کھیت وکھلیان ریتلے صحرا میں

تبدیل ہو گئے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ دریائے ہاکڑہ کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ تقریباً چار سو کے قریب تاریخی اہمیت کے حامل کھنڈرات کے نشانات ملتے ہیں۔ ان تاریخی آثاروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چار سے پانچ ہزار سال پُرانے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چولستان کی قدیم تہذیب کے آثار موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی تہذیبوں جتنے ہی پُرانے ہیں۔

چولستان میں پانی کی قلت ایک اہم مسئلہ ہے۔ لوگ ٹوبوں سے پانی پینے پر مجبور ہیں۔ ٹوبے کسی گہرے علاقے میں بارش کے پانی کے جمع ہو جانے کو کہتے ہیں۔ زمین کے 80 فٹ نیچے پانی موجود ہے، تاہم وہ کڑوا ہے۔ محققین کے مطابق قبل از مسیح چولستان ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ چوں کہ یہاں سے دریائے ہاکڑہ گزرتا تھا، اس لیے پانی کی کمی نہ تھی۔ 600 قبل مسیح میں پانی میں کمی آنا شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ پانی کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تہذیب بھی ختم ہوتی گئی۔

چولستان کی معیشت کا انحصار زیادہ تر مختلف جانوروں گائے، بکریوں اور بھیڑوں پر ہے۔ اونٹ ان کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے۔ مقامی لوگ اونٹوں کو دوڑ کے مقابلوں میں استعمال کرتے ہیں۔ انہیں رقص کرنا سکھاتے ہیں۔ اونٹ کو رنگ برنگے کپڑوں اور پھندنے لگا کر سجایا جاتا ہے۔ اس سجاوٹ کے ساتھ اونٹ جب رقص کرتا ہے تو ایک دل کش منظر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اونٹ کی اون اور کھال بہترین کپڑا اور ظروف بنانے میں کام آتی ہے۔ اس اون سے قالین اور کھدر کا کپڑا بھی بنتا ہے۔ اس کے علاوہ موسم سرما میں یہاں دستکاری اور مٹی کے برتن بھی بنائے جاتے ہیں۔ مٹی کے برتنوں کے لیے احمد پور شرقیہ پورے پاکستان میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ چمڑے کی مصنوعات یہاں کے لوگوں کی مہارت کا ثبوت ہیں۔ یہاں کی خواتین اپنی فطرت کے مطابق زیورات میں خصوصی دل چسپی رکھتی ہیں۔ باقی صحرائی علاقوں کی طرح یہاں بھی خواتین کی کلائیاں چوڑیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ یہاں سالانہ 12 سینٹی میٹر بارش ہوتی ہے۔ اس صحرا میں بارش کے پانی سے اُگنے والا ایک جنگل بھی موجود ہے۔ چولستان میں قلعہ ڈیراور کے پاس سنگِ مرمر سے ایک عالی شان مسجد تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد نواب محمد بہاول خان عباسی نے 1845ء میں تعمیر کروائی۔ یہ مسجد دہلی کی جامع مسجد اور کسی قدر بابری مسجد سے مشابہت رکھتی ہے۔ سنگِ مرمر سے تعمیر کردہ یہ مسجد خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ چنن پیر کا مزار یہاں ایک خاص روحانی مقام کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ مزار یزمان سے 26 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہر سال مارچ میں ایک میلہ لگتا ہے جو تقریباً سات ہفتے تک جاری رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر چولستانی اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار اس میلے میں ضرور شرکت کرتا ہے۔ مقامی لوگ دن رات یہاں دعائیں مانگتے ہیں اور گاتے بھی ہیں۔

سوہنا چنن پیر　　　ڈیوے پتر تے کھیر

لوگوں کے نزدیک یہاں آ کر من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ یہاں فروری کے مہینے میں ہونے والی جیپ ریلی پاکستان سمیت دُنیا بھر میں اپنی خاص پہچان رکھتی ہے اور سیاحوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ چولستان ڈیزرٹ جیپ ریلی کا پہلی بار انعقاد 1995ء میں کیا گیا تھا۔ یہ جیپ ریلی بلاشبہ یہاں کی علاقائی، ثقافتی اور تاریخی ورثے کی طرف بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے کی کوشش ہے۔ اس ریلی میں چاروں صوبوں سے افراد شریک ہوتے ہیں۔ یوں مقابلے کے لیے صحت مند ماحول کے ساتھ ساتھ بھائی چارا اور باہمی اتحاد و یک جہتی کو بھی فروغ ملتا ہے۔

چولستان بہاول پور شہر سے تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وسیع و عریض صحرا ہے جس کا رقبہ تقریباً 26300 مربع کلومیٹر ہے۔ یہ ایک طرف سے سندھ میں صحرائے تھر تک جاتا ہے تو دوسری طرف یہ بھارت میں راجستھان تک پھیلا ہوا ہے۔ چولستان کی سیاحت کے لیے آپ جانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے جنوبی پنجاب کے شہر بہاول پور جانا پڑے گا۔ صحرائے چولستان کے گرد بہاول پور، بہاول نگر اور رحیم یار خان کے اضلاع ہیں۔ بہاول پور کو صحرائے چولستان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ یہ شہر لاہور سے تقریباً 440 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ریل گاڑی یا بس کے ذریعے یہاں بآسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ سیاحوں کے قیام کے لیے یہاں درمیانے درجے کے ہوٹل اور ریسٹ ہاؤس وغیرہ موجود ہیں۔ ماہرین کے مطابق اس علاقے کی سیاحت کے لیے اکتوبر سے مارچ تک کا عرصہ زیادہ بہتر ہے کیوں کہ اس وقت یہاں کا موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/دسمبر 2016ء ہے۔
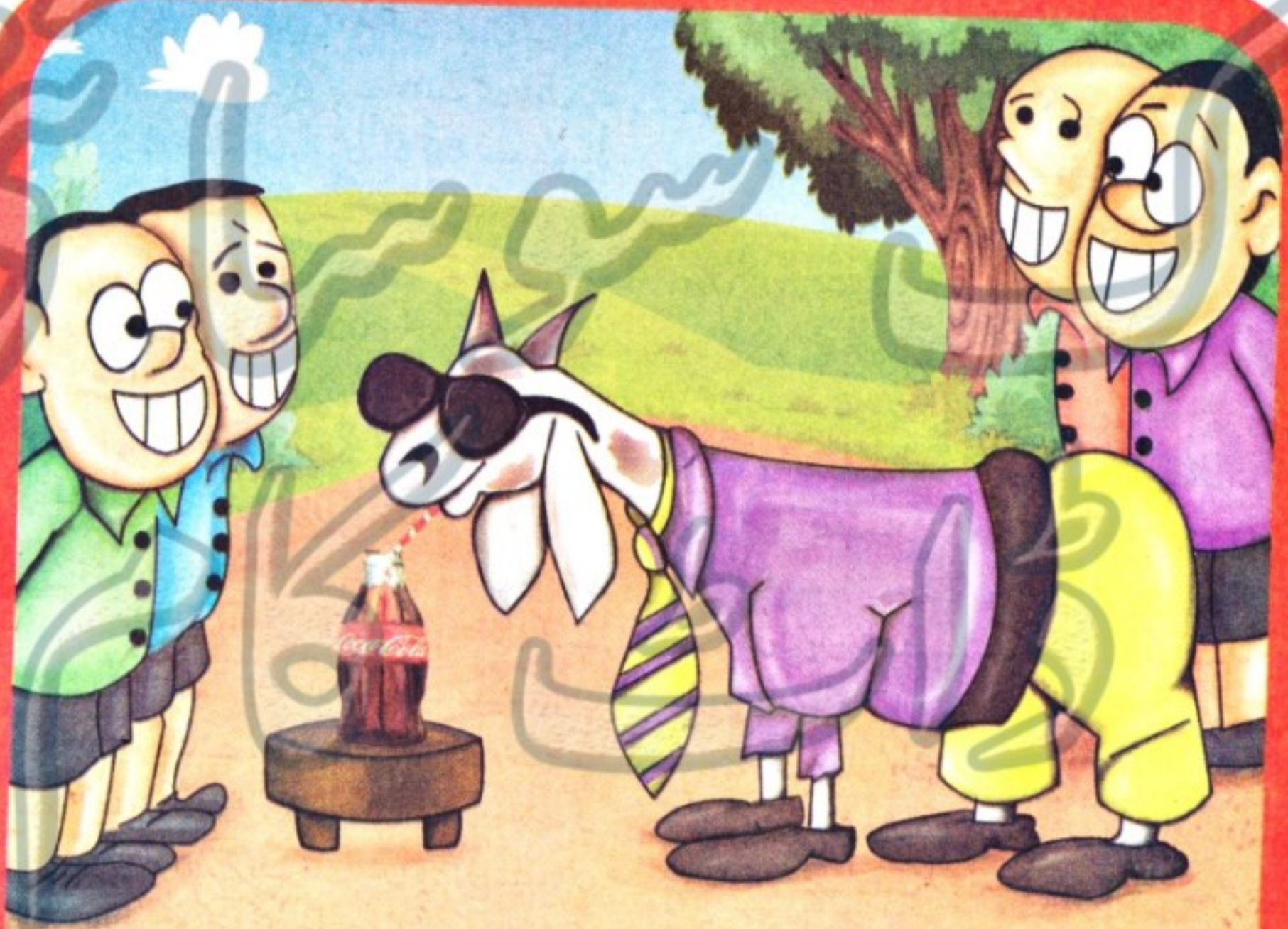
نومبر 2016ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- دعا کوئی ورزش سے بہتر نہیں ہے، یہ نسخہ ہے کم خرچ بالانشیں (خنسہ حسینی، کلورکوٹ)
- وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا، ہمت کرے کچھوا تو کیا ہو نہیں سکتا (ربیعہ توقیر، کراچی)
- اب ہم نے اسمارٹ ہونا ہے، ارے اسی بات کا تو رونا ہے (ایمن فاطمہ، ملتان)
- بے خطر کود پڑا جم میں کچھوا، خرگوش ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (بشریٰ صفدر، تلہ گنگ)
- جانور ہوگئے بڑے سیانے، جانے لگے ہیں جم خانے (فائزہ رزاق، خانیوال)

ہونہار مصور

لاری اڈہ

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

ملیحہ شہباز، راول پنڈی (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

اصباح شاہد، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

آدینہ نور، سیال کوٹ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

سحر ارشد، گوجرانوالہ (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

محمد شمعون بٹ، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد شیراز، گوجرانوالہ۔ آمنہ جمال، لاہور۔ جویریہ طارق، راول پنڈی۔ بشریٰ حسینی، کلورکوٹ۔ آمنہ اقبال، فوجی فاؤنڈیشن۔ ایمان حیدر، راول پنڈی۔ جویریہ طارق، راول پنڈی۔ طہٰ افتخار، واہ کینٹ۔ مسفر ظفر اقبال، راول پنڈی۔ سارہ فاطمہ، میانوالی۔ عائشہ صدیقہ بنت محمد وحید، راول پنڈی۔ سمیرا زاہد۔ محمد بن حسن، لاہور۔ دانیال حسن، لاہور۔ بارک رحمٰن، گوجرانوالہ۔ ماہ نور فاطمہ، راول پنڈی۔ محمد منیبہ ستار، سیال کوٹ۔ ابراہیم اکبر خان، رحیم یار خان۔ ولیجہ فاطمہ، فوجی فاؤنڈیشن۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ مرزا عزم الحسن، گجرات۔ آمنہ مجاہد منیر، فیلڈ پبلک اسکول۔ سید تیمور علی خالد، جھنگ صدر۔ زرنب سلیم، لاہور۔ فصیحہ فاطمہ، راول پنڈی۔ عروسہ خالد، اٹک۔ اعیان جنید، حیدر آباد۔ عثمان حیدر، پشاور۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ بشریٰ بتول، رسال پور۔ نور الامین، اسلام آباد۔ سعود الحسن، خانیوال۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ ثوبیہ سلیم، لاہور۔ سجاد حیدر، کراچی۔ ظل ہما، حیدر آباد۔ جلال عابد بٹ، دینہ۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتہ لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دسمبر کا موضوع
پاک فوج
آخری تاریخ 8 دسمبر

جنوری کا موضوع
کرکٹ میچ
آخری تاریخ 8 جنوری